حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

سلسلہ نمبر۔۱۸

کلام حیدری

پروفیسر شہزاد انجم

Monograph-18

Kalam Hydri

By : Prof. Shahzad Anjum

کلام حیدری اعلیٰ پایہ کے ترقی پسند افسانہ نگار اور بلند قامت صحافی تھے۔انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت اور مثالی فعالیت سے دنیائے ادب اور صحافت میں جو ناموری، شہرت اور مقبولیت حاصل کی وہ قابل رشک ہے۔ادبی محفل آرائی، اردو ادبا و شعراء کی مثالی قدر دانی، دوستداری، ادبی سرگرمیوں میں انہماک وحصے داری ان کی شخصیت کی شان تھیں۔

کلام حیدری کا گھر 'رینہ ہاؤس' (گیا) ایک تاریخی وادبی مرکز کی حیثیت کا حامل تھا۔یہاں مسلسل انجمن آرائیاں ہوتیں، بحث ومباحثے اور شعر وسخن کی محفلیں سجتیں اور شعر وادب کے قمقمے جگمگاتے رہتے۔ان محفلوں میں بڑی جلیل قدر اور قدآور شخصیتیں تشریف لاتیں۔علم وفن اور شعر وادب کی شمعیں روشن ہوتیں۔دنیائے ادب جگمگاتی رہتی۔یہ ایک ایسا تاریخی اور نادر دور تھا جو اب خواب وخیال سا لگتا ہے۔'رینہ ہاؤس' میں شب وروز تشریف لانے والی ادب کی مقتدر اور سرکردہ شخصیتوں میں پروفیسر احتشام حسین، ساحر لدھیانوی، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، رام لعل، بشیر بدر، اختر اورینوی، وحید اختر، کیفی اعظمی، مظہر امام، ڈاکٹر اعجاز حسین، خلیل الرحمن اعظمی، قمر رئیس، وفا ملک پوری، غیاث احمد گدی، شمیم حنفی، احمد یوسف، وہاب اشرفی، حسن نعیم، بدیع مشہدی، شہاب جعفری، سہیل عظیم آبادی، پروفیسر علیم اللہ حالی، پروفیسر عبدالصمد اور سید احمد قادری جیسی ادبی شخصیتیں شامل تھیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہر سال ایک جنوری کو 'رینہ ہاؤس' کو دلہن کی طرح سجایا جاتا۔نئے سال کے استقبال میں زبردست اہتمام کیا جاتا اور اس دن کلام حیدری کے ادبی وسماجی احباب کی شرکت سے یہ گھر بقعۂ نور بنا رہتا۔

کلام حیدری کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔1949ء میں ان کا پہلا افسانہ ''بھابی'' کلکتے کے رسالہ ''جدید اردو'' میں شائع ہوا۔اس کے بعد انھوں نے خوب سے خوب تر افسانوں کا ایک سلسلہ شروع کردیا۔یکے۔بعد دیگرے ان کے چار افسانوی مجموعے ۱۔بے نام گلیاں (۱۹۵۵ء)، ۲۔صفر (۱۹۷۴ء)، ۳۔الف لام میم (۱۹۷۹ء)، ۴۔گولڈن جوبلی (۱۹۸۳ء) منظر عام پر آئے۔

کلام حیدری ایک کامیاب افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ایک اچھے صحافی بھی تھے۔انھوں نے ۱۹۴۷ء میں کلکتے سے ماہنامہ ''نغمہ ونور'' جاری کیا۔گیا سے مشہور زمانہ ہفتہ وار اخبار ''مورچہ'' نکالا۔وہیں سے ایک ماہنامہ ''آہنگ'' جاری کیا، جس کا ''فکشن نمبر'' کافی مشہور ہوا۔ان کے علاوہ ان کی کئی ادبی تصانیف ان کی علمیت اور ذکاوت کا ثبوت ہیں۔

کلام حیدری نے افسانوی مجموعوں، تنقیدی مقالوں اور اداریوں کے مجموعہ ودیگر تصانیف کی شکل میں جو گرانقدر ادبی وصحافتی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ان کی ادبی شخصیت کی بقا کا ضامن ہے۔

عصر حاضر کے معتبر ناقدین اور محققین میں شہزاد انجم کا نام ایک منفرد شناخت کا حامل ہے۔انھیں ایک اعلیٰ نظر ناقد، دیدہ ور محقق اور اچھے ادیب کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ان کے باکمال قلم سے تقریباً دو درجن تنقیدی، تحقیقی اور ادبی کتابیں وجود پذیر ہو چکی ہیں۔انھوں نے کئی فرد نامے (مونوگراف) لکھے ہیں، جن میں مرزا اسد اللہ خاں غالب، سید محمد حسنین، سید احتشام حسین، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد علی جوہر کے نام شامل ہیں۔شہزاد انجم کی تحریر کی تنقیدی ذہانت، فکری بلاغت اور تجزیے کی ذکاوت اہل نظر کو متاثر کرتی ہیں۔

کلام حیدری، شہزاد انجم کے آبائی ضلع گیا (بہار) سے تعلق رکھتے ہیں۔اس لئے ذہنی ہم آہنگی نے اس فرد نامے کی تخلیق میں خلوص وفکر نظر کو جلا بخشی ہے۔یہ فرد نامہ کلام حیدری کی شخصیت اور ان کی فنی جہات کو بطریق احسن پیش کرنے میں کامیاب ہے۔

—اسلم جاوداں

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِ دبستانِ بہار

فرد نامہ

کلام حیدری

پروفیسر شہزاد انجم

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔۱۸

Kalam Haideri

By

Prof. Shahzad Anjum

نام کتاب	:	کلام حیدری
مصنف	:	پروفیسر شہزاد انجم
سال اشاعت	:	2022ء
کل صفحات	:	140
کمپوزنگ وتزئین	:	منصور رضا، گیا
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ
طابع	:	نیو فائن آرٹ آفسیٹ، درگاہ روڈ، پٹنہ۔٦

ملنے کا پتہ:
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر: 0612-2530093، ای میل: directorurdu@gmail.com

فہرست

پیش لفظ	احمد محمود	4
ابتدائیہ	پروفیسر شہزاد انجم	6
کلام حیدری : ایک نظر میں	—	10
کلام حیدری : سوانح اور شخصیت	—	12
کلام حیدری کی افسانہ نگاری	—	33
کلام حیدری کی صحافتی خدمات	—	65
کلام حیدری کی تنقید نگاری	—	76
انتخاب نگارشات	—	103
• سخی (افسانہ)	—	104
• زندگانی (افسانہ)	—	110
• روشنی کی ضمانت (افسانہ)	—	116
• اپنی زندگی کے کچھ سچ (خودنوشت)	—	121
• منتخب اداریے	—	131

پیش لفظ

دبستان لکھنؤ، دبستان دہلی اور دبستان دکن کی طرح اپنے مخصوص اور بیش قیمت شعری و ادبی روایت اور سرمائے کی بنیاد پر دبستان بہار بھی ایک اہمیت کا حامل ہے۔

سرزمین بہار میں شعر و ادب کی یکتائے زمانہ اور باکمال شخصیتیں ہر دور میں ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں اور اپنے کمالِ فن سے دنیائے ادب میں بہار کا نام روشن کرتی رہی ہیں۔

شادؔ عظیم آبادی، امداد امام اثرؔ، شوقؔ نیموی، فضلِ حق آزاد، بیدل عظیم آبادی، انجم مانپوری، اختر اورینوی، جمیل مظہری، سہیلؔ عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، قاضی عبدالودود، کلیم عاجزؔ، مظہر امام، عبدالصمد، شوکت حیات، احمد یوسف اور شفیع مشہدی جیسی بے مثل اور یکتائے زمانہ ادبی شخصیتوں نے پوری ادبی دنیا میں بہار کی شعری و ادبی عظمت و اہمیت کا پرچم لہرایا اور دبستان بہار کو مضبوط شناخت عطا کی۔ دبستان بہار کی شعری و ادبی روایت اس قدر مقتدر اور وقیع ہے کہ دنیائے ادب اسے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان کا اعتراف کرنے پر مجبور ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ دبستان بہار کی جملہ سرکردہ اور مقتدر ادبی شخصیتوں کی وقیع خدمات شعر و ادب کا اعتراف کرتا ہے۔ ان کے ادبی سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور اسے نئی نسل تک پہنچانا اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ نے گزشتہ دنوں دس مشاہیر ادب بہار ۱۔ شادؔ عظیم آبادی، ۲۔ پرویزؔ شاہدی، ۳۔ کلیم الدین احمد، ۴۔ رضا نقوی واہیؔ، ۵۔ علامہ واقفؔ عظیم آبادی، ۶۔ عبدالمغنی، ۷۔ وہاب اشرفی، ۸۔ رمزؔ عظیم آبادی، ۹۔ شین مظفر پوری، ۱۰۔ کلیم عاجزؔ کے فردنامے (مونوگراف) شائع کرائے۔ ان فردناموں کا ادبی دنیا میں زبردست استقبال کیا گیا اور اردو ڈائرکٹوریٹ کی اس پیش کش کو اہم اور قیمتی قرار دیا گیا نیز مزید مشاہیر دبستان بہار پر فردنامے کی اشاعت کا مطالبہ بھی گیا ہے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ نے دانشورانِ شعر وادب کی ایک اہم مشاورتی نشست میں مشوروں کے بعد اتفاق رائے سے مزید ۳۲ فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا۔ جن گراں قدر ادبی شخصیتوں پر فردناموں کی اشاعت کا فیصلہ لیا گیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

۱۔ امداد امام اثرؔ، ۲۔ فضل حق آزاد عظیم آبادی، ۳۔ شوقؔ نیموی، ۴۔ انجم مانپوری، ۵۔ یاس یگانہ چنگیزی، ۶۔ بیدل عظیم آبادی، ۷۔ قاضی عبدالودود، ۸۔ جمیل مظہری، ۹۔ اختر اورینوی، ۱۰۔ سہیل عظیم آبادی، ۱۱۔ شکیلہ اختر، ۱۲۔ حسن نعیم، ۱۳۔ غیاث احمد گدی، ۱۴۔ کلام حیدری، ۱۵۔ احمد یوسف، ۱۶۔ صدیق مجیبی، ۱۷۔ احمد جمال پاشا، ۱۸۔ اویس احمد دوراںؔ، ۱۹۔ لطف الرحمٰن، ۲۰۔ اسرار جامعی، ۲۱۔ جمیلہ خدا بخش، ۲۲۔ رشیدۃ النساء، ۲۳۔ بیتاب صدیقی، ۲۴۔ قمر اعظم ہاشمی، ۲۵۔ راسخؔ عظیم آبادی، ۲۶۔ عبدالغفور شہباز، ۲۷۔ پیغام آفاقی، ۲۸۔ غلام سرور، ۲۹۔ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی، ۳۰۔ مظہر امام، ۳۱۔ اجتبیٰ رضوی، ۳۲۔ کیف عظیم آبادی۔

کلام حیدری اردو کے ایک معتبر افسانہ نگار اور مشہور صحافی کی حیثیت سے اپنی ایک نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی گراں قدر نگارشات سے دبستانِ بہار کا نام روشن کیا۔

اس فردنامے کے مصنف پروفیسر شہزاد انجم، جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی) میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کلام حیدری اُن کے آبائی شہر گیا کی ایک بڑی سرگرم ادبی شخصیت کی حیثیت سے نہایت مقبول اور مشہور رہے۔ لہٰذا فطری طور پر پروفیسر شہزاد انجم کا لگاؤ کلام حیدری سے رہا اور انھوں نے بڑی تحقیق اور ترتیب کے ساتھ یہ فردنامہ لکھا ہے۔ امید ہے کہ اُن کی یہ تصنیف کلام حیدری کی شخصیت، ادبی خدمات اور اُن کے صحافتی مقام کو سمجھنے میں خصوصی معاون ہوگی۔

احمد محمود
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

اُردو کے ممتاز افسانہ نگار، صحافی، نقّاد، مبصّر اور دانشور کلام حیدری کی شخصیت اور ادبی کارناموں پر محیط یہ مونوگراف حاضر خدمت ہے۔ کلام حیدری کی شخصیت اور ادبی جہات کی اتنی پرتیں ہیں، اُن میں کچھ ایسی انفرادیت اور دلکشی ہے، کہ اُن تمام کو احاطۂ قلم میں لانا بے حد مشکل ہے۔ وہ انتہائی ذہین، ذکی الحس اور بے خوف ادیب تھے۔ اُن کی نثر میں بلا کی تازگی، دلکشی اور دلآویزی ہے۔ کلام حیدری ایک مدبر، مفکر اور اعلیٰ اقدار کے حامل انسان تھے۔ اُن کے افسانوں کے چار مجموعے، بے نام گلیاں، صفر، الف لام میم اور گولڈن جوبلی ہیں۔ ان تصانیف کے علاوہ کتابی صورت میں اُن کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''تفہیمات'' ہفتہ وار مورچہ کے منتخب اداریے ''فراز دار''، ادبی تبصروں کا مجموعہ ''برملا''، رسالہ ماہنامہ ''آہنگ'' گیا کے اداریوں کا مجموعہ ''مزامیر'' شامل ہیں۔ انھوں نے اپنی ادارت میں اُردو کا معروف ادبی ماہنامہ رسالہ ''آہنگ'' تقریباً بائیس برسوں تک شائع کیا۔ کلام حیدری نے سماجی اور ادبی موضوعات پر مبنی ہفتہ وار ''مورچہ'' (گیا) کی اشاعت بھی اپنی ادارت میں طویل عرصے تک کی۔ اسے آپ اُن کا کُل سرمایۂ حیات بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُن کی یہ تحریریں نہایت اثرانگیز ہیں، جن کا نقش بے حد گہرا ہے۔

کلام حیدری کی شخصیت میں حد درجہ جاذبیت اور غضب کی کشش تھی۔ وہ ایک حسین وجمیل انسان تھے۔ اُن کی پیشانی پر ایک خاص قسم کی ذہانت آمیز چمک تھی۔ اُن کا متبسّم چہرہ، گفتگو کا خوبصورت لب ولہجہ اور ادبی افکار کے سلسلے میں اُن کی بیباکانہ، بے لاگ آرا اور ادب کے تئیں انفرادی سوچ وغیرہ کی اکثر یاد آتی ہے۔ وہ نہایت بے خوفی اور استدلال سے ادبی معاملات میں اپنا واضح موقف رکھنے والے انسان تھے۔ وہ کبھی بھی بڑے سے بڑے ادیبوں سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ جب بھی انھیں کسی ادبی نکتے سے اختلاف ہوتا وہ برملا اپنی رائے کا اظہار کرتے، اسی لیے اُس عہد کے اکثر ادیب اُن سے گھبراتے تھے۔ ادبی مناقشے میں انھیں لطف آتا۔ وہ اپنی کاٹ دار نثر سے مخالف کو زیر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ وہ تقریر وتحریر دونوں فن کے مرد میداں تھے۔ اُن کے یہاں کسی بھی طرح کی مصلحت کا گزر نہیں تھا۔ کلام حیدری ادب کی دیوقامت شخصیتوں سے بھی اختلاف کرنے سے ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ وہ حد درجہ متواضع اور

دوستدار انسان تھے مگر وہ کب کس سے اور کس بات پر خفا ہو جائیں خود اُنھیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

کلام حیدری کی رہائش ایک عالیشان کوٹھی ''رینا ہاؤس''، جگجیون روڈ، گیا، پر واقع تھی، جہاں روزانہ شام کے وقت علمی و ادبی محفلیں جمتیں، ادب و سماج، سیاست و ثقافت کے مسائل پر زوردار بحثیں ہوتیں۔ ملک کے نامور شعرا و ادبا اکثر اُن کے مہمان ہوتے۔ اُن ادیبوں کے اعزاز میں جلسے ہوتے۔ کلام حیدری نے ادبی و ثقافتی سرگرمیوں کے لیے ایک تنظیم ''دی کلچرل اکیڈمی، گیا'' قائم کی تھی، جس کے تحت کتابوں کی اشاعت ہوتی اور علمی و ادبی جلسے منعقد ہوتے تھے۔ رسالہ ماہنامہ ''آہنگ'' اور ہفتہ وار ''مورچہ'' کے بیشتر دفتری کام ان کی اِسی رہائش گاہ سے ہوتے۔ اُن کی اپنی ذاتی لائبریری، نادر کتابوں اور رسائل سے اَٹی پڑی تھی، جس سے اُن کے تمام احباب استفادہ کرتے۔ وہ ایک علم دوست اور شعر و ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے فرد تھے۔ کلام حیدری نہایت ذی حیثیت، خوش شکل، خوش لباس، معمولات زندگی کے پابند، خوش گفتار، بہترین مقرر اور ممتاز صنعت کار تھے۔ ادبی مجلسوں و محفلوں میں وہ اپنی ذہانت و ذکاوت سے پُر گفتگو اور چبھتے، کاٹ دار جملوں کی وجہ سے چھا جایا کرتے تھے۔ قدرت نے اُنھیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا اس لیے اُن کے مخالفین کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ دراصل بیشتر لوگ اُن کے مخالف کم اور حاسد زیادہ تھے۔

کلام حیدری کا شمار اپنے عہد کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے اُن کی گہری وابستگی تھی۔ جنگ آزادی میں بھی وہ طالب علمی کے زمانے میں پیش پیش تھے۔ اُن کی پوری زندگی جدوجہد سے پُر تھی۔ اُن کے افسانوں کے بیشتر موضوعات اُن کی اپنی زندگی سے اخذ کردہ ہیں۔ اپنی افسانہ نگاری کا آغاز انھوں نے حقیقت پسند افسانہ نگاروں کی طرح ترقی پسند تحریک کے زیر اثر بیانیہ اسلوب سے کیا، مگر آہستہ آہستہ اس میں تبدیلی آتی گئی۔ استعاراتی اور علامتی انداز بیان اور داستانوی رنگ اُن کے افسانوں پر غالب آتا گیا۔ کلام حیدری کے افسانوں میں اُن کا اپنا ماضی، مختلف انداز اور منفرد پیکروں میں نمایاں ہے۔ اُن کے افسانوی کرداروں میں شدت جذبات کا رنگ گہرا ہے اور داخلی انتشار و ہیجان کا موثر اظہار ہے۔ ان کے افسانوں میں اُن کی خلاّقی، ذہانت و ذکاوت، اسلوب بیان پر گہری گرفت اور خود کلامی کے عناصر روشن ہیں۔ اُن کے بعد کے افسانوں پر جدید رجحان و رویّے کا اثر ضرور پڑا، مگر اُن کا ماضی ہمیشہ اُن کے سامنے کھڑا رہتا جو انھیں حقیقت نگاری، بیانیہ اسلوب کی طرف مہمیز کرتا رہتا۔ تخلیقی زبان لکھنے پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ اُن کا پیرایۂ بیان شگفتہ اور اثر انگیز ہے۔

کلام حیدری کی ایک اہم شناخت ایک صحافی کی بھی ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی ماہنامہ ''آہنگ'' اور ہفتہ وار ''مورچہ'' کی اشاعت سے شہر گیا کو ہندوستان کے ادبی اُفق پر نمایاں کر دیا تھا اور شہر گیا کو اہم ادبی مرکز بنا دیا تھا۔ ''آہنگ'' کے اداریے، ترتیب و تزئین، تبصرے، ادبی مباحث، نئے قلم کاروں کو متعارف کرانے کا سلسلہ، اہم تخلیقات کی پذیرائی، ادبی بُت شکنی، ادب کے مختلف مسائل پر بیباکانہ اظہار اور فکر مندی نے کلام حیدری کو ایک قد آور صحافی کے طور پر ممتاز مقام عطا کیا۔ اُردو کی ادبی صحافت میں کلام حیدری کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔

ایک تنقید نگار اور مبصر کے طور پر بھی کلام حیدری کافی مقبول تھے۔ حالانکہ انھوں نے اس بات پر اصرار کیا ہے کہ تنقید اُن کا میدان نہیں ہے، تاثرات کو لکھ دینا اُن کی مجبوری ہے۔ اُن کے تنقیدی مضامین میں خاص تازگی ہے۔ وہ عام رویّے سے ہٹ کر اپنے نظریے کو مدلل انداز میں پیش کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ جوش ملیح آبادی، سعادت حسن منٹو، حسرت موہانی اور پریم چند پر اُن کے جو مضامین ہیں وہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ مذکورہ ادیبوں کا مطالعہ انھوں نے جس بلیغ، مدلل اور نئی جہت سے کیا ہے، وہ اُن کا اختصاص ہے۔ کلام حیدری کی نثر کی شان، اُن کی تخلیقی زبان، کاٹ دار جملے، غیر مصلحت کوشی اور بیباکانہ اظہار رائے ہے۔ ایک زمانے میں ''آہنگ'' میں اُن کے تبصروں کا قارئین کو انتظار رہتا تھا۔ وہ بُت پرست نہیں بُت شکن تھے۔ انھوں نے بڑے سے بڑے ادبی بتوں کی پروا نہیں کی اور جس کتاب یا مضمون پر لکھا، کھُل کر اپنی رائے دی۔ وہ صوبہ بہار کے انمول رتن تھے۔ افسوس کہ اُن کی زندگی نے زیادہ وفا نہیں کی۔ وہ دِل کے عارضے میں مبتلا ہو گئے اور محض ترسٹھ برس کی عمر میں اِس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے، آمین۔ کلام حیدری نے جو اپنا علمی سرمایہ چھوڑا ہے، جو تحریریں صفحہ قرطاس پر ثبت کی ہیں، وہ سب بلا شبہ ادب کا بیش قیمت اثاثہ ہیں۔

کلام حیدری سے میرا ایک خاص ربط تھا۔ میرے والد محترم قمر نظامی گیاوی سے اُن کا والہانہ رشتہ تھا۔ والد محترم نے آہنگ کے متعدد شماروں اور اُن کی کئی کتابوں کی کتابت کی تھی۔ مجھے بھی آہنگ کے چند شماروں کی کتابت کا موقع ملا۔ میرے استاد اور خسر محترم پروفیسر تاج انور صاحب طویل عرصے تک رسالہ ''آہنگ'' کے معاون مدیر رہے۔ کلام حیدری کو مجھے بے حد قریب سے دیکھنے، سننے اور جاننے کا موقع ملا۔ میں اُن سے ذاتی طور پر بے حد متاثر اور اُن کا قدرداں رہا ہوں۔ میری دعوت پر گیا کی کئی ادبی محفلوں، مجلسوں میں انھوں نے شرکت کی اور نوجوان قلم کاروں کی حوصلہ افزائی کی۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس تھا کہ کلام

حیدری کا مجھ پر کوئی قرض ہے۔ اُس ذہین فنکار کی وہ قدر دانی نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ جب میں رام پور کے پوسٹ گریجویٹ کالج میں بحیثیت لکچرر اُردو، وابستہ تھا تو ''کلام حیدری کی شخصیت اور ادبی کارنامے''، موضوع پر میری نگرانی میں شگفتہ خانم نے روہیلکھنڈ یونیورسٹی، بریلی (اتر پردیش) سے پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا تھا، جس پر انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض ہوئی تھی، مگر افسوس کہ وہ مقالہ کتابی شکل میں شائع نہیں ہوسکا۔

میں اُردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے ڈائرکٹر احمد محمود صاحب اور ادبی مشیر اسلم جاوداں صاحب کا حد درجہ شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری محبوب و محترم شخصیت کلام حیدری پر فردنامہ (مونوگراف) لکھنے کا موقع عنایت کیا۔ مجھے امید ہے یہ فردنامہ کلام حیدری شناسی میں ایک بنیادی اینٹ کا کام کرے گا اور اس کے بعد کلام حیدری کی تحقیق و تنقید کے نئے دَروا ہوں گے۔

اُردو ڈائرکٹوریٹ کے ارباب حل وعقد کا شکریہ اس لیے بھی لازم ہے کہ انھوں نے بہار کے اُن ادیبوں پر فردنامہ لکھوانے کا سلسلہ شروع کیا ہے جن کے کارنامے ادبی دنیا میں غیر معمولی ہیں، مگر افسوس کہ انھیں کم ہی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فردنامہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پروفیسر شہزاد انجم
صدر شعبۂ اُردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵

فردنامہ

کلام حیدری: ایک نظر میں

- نام : محمد کلام الحق حیدری
- قلمی نام : کلام حیدری
- والد محترم کا نام : محمد انعام الحق
- والدہ محترمہ کا نام : نور العین
- وطن : موضع پچنہ، شیخ پورہ، مونگیر (بہار)
- پیدائش : ۲/اپریل ۱۹۳۰ء
  ان کی نانیہال میں، موضع رانکڑ، ضلع مونگیر، بہار
- ابتدائی تعلیم : محلّہ نوشیان، جلیسر، ضلع ایٹہ، اتر پردیش
  (اپنے نانا ڈاکٹر علی حسن کے زیر نگرانی)
- پہلے استاد : جناب اللہ بخش (جلیسر، ضلع ایٹہ، اتر پردیش)
- آٹھویں کلاس : مسلم ہائی اسکول، پٹنہ
- نویں کلاس : رام موہن رائے سمینری، پٹنہ
- میٹرک (دسویں کلاس) : ۱۹۴۵ء مسلم ہائی اسکول، پٹنہ
  (اس زمانے میں میٹرک کا امتحان بھی پٹنہ یونیورسٹی کے تحت ہی ہوا کرتا تھا)
- انٹرمیڈیٹ : رپن کالج، کلکتہ، ۱۹۴۷ء
  (انٹرمیڈیٹ کے بعد انھوں نے سینٹ زیویرس کالج، کلکتہ میں تھرڈ ائیر کامرس میں داخلہ لیا۔)

- رسالہ نغمہ ونور : اسی زمانے میں انھوں نے اپنے دوست کے ساتھ رسالہ نغمہ و نور کا اجرا کیا، مگر اختلاف ہونے کی وجہ سے اس سے بہت جلد دست بردار ہو گئے۔
- رنگ پور (بنگلہ دیش) کا قیام : ۱۹۴۷ء، جہاں انھوں نے اپنا ریستورانت کھولا اور سنیما ہال میں آپریٹر اور مینیجر کی ذمہ داری نبھائی۔
- رنگ پور سے رانچی آمد : ۱۹۴۷ء
- بی اے (اُردو) : ۱۹۵۰ء، رانچی کالج، رانچی
فرسٹ کلاس آنرز امتیازی نمبروں کے ساتھ
- ایم اے (اُردو) : ۱۹۵۲ء، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ
فرسٹ ڈویژن، فرسٹ پوزیشن
- ملازمت بحیثیت لکچرر اُردو : ۱۹۵۲ء پورنیہ کالج، پورنیہ
- شادی : ۱۹۵۶ء، شاہدہ خیر بنت ڈاکٹر ابوالخیر، گیا (بہار)
- کاروباری دنیا میں شمولیت : ۱۹۵۶ء محلّہ بیراگی، گیا (بہار) میں کنکریٹ پائپ کارخانے کا قیام کیا۔

پورنیہ کالج سے استعفیٰ دے کر گیا میں مستقل قیام۔ ۱۹۵۶ء سے

- اولاد : نگارینہ حیدری، پیدائش ۱۹۵۸ء
- ہفتہ وار ''مورچہ''، گیا کا اجرا : ۱۹۶۳ء
- ادبی ماہنامہ رسالہ ''آہنگ''، گیا کا اجرا: ۱۹۶۶ء
- دِل کا پہلا دورہ : ۲، نومبر ۱۹۹۲ء (دہلی)
- دِل کا آپریشن : ۲۴، فروری ۱۹۹۳ء
اسکارٹ ہسپتال، دہلی میں ڈاکٹر نریش ترامہن نے کیا
- دِل کا دوسرا دورہ : ۲، فروری ۱۹۹۴ء (گیا)

- **تصنیفات وتالیفات:**
- **افسانوی مجموعے:**

۱۔ بے نام گلیاں فروری، ۱۹۵۵ء مِلک کتاب گھر، رانچی
۲۔ صفر ستمبر ۱۹۷۴ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا
۳۔ الف لام میم فروری، ۱۹۷۹ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا
۴۔ گولڈن جوبلی نومبر ۱۹۸۳ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **تنقیدی مضامین کا مجموعہ:**

۱۔ تفہیمات ۱۹۸۳ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **منتخب اداریے (ہفتہ وار مورچہ سے):**

۱۔ فراز دار دسمبر، ۱۹۷۹ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **ادبی تبصروں کا مجموعہ:**

۱۔ برملا مارچ، ۱۹۸۰ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **ادبی تنقید کی جھلکیاں:**

۱۔ مزامیر جون، ۱۹۷۹ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **تصوف کے موضوع پر کتاب:**

۱۔ ادب اور تصوّف ۱۹۸۴ء دی کلچرل اکیڈمی، گیا

- **اُردو افسانوں کا انتخاب:**

۱۔ ارتقا سیریز۔ (۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کے اُردو کے اہم افسانوں کا انتخاب)

- **ترجمہ:**

۱۔ تذکرہ شعرائے گجرات (فارسی سے اُردو ترجمہ)

- **صحافت:**

۱۔ ماہنامہ نغمہ ونور، کلکتہ، ۱۹۴۷ء
۲۔ ہفتہ وار مورچہ، گیا، ۱۹۶۳ء

۳۔ ادبی ماہنامہ آہنگ، گیا، ۱۹۶۶ء

- **تالیفات:**

۱۔ جمیل مظہری نمبر، ماہنامہ سہیل گیا (دو جلدوں میں)
۲۔ بھاگلپور کا ادبی ماحول نمبر، ماہنامہ سہیل گیا
۳۔ احتشام حسین نمبر، ماہنامہ آہنگ، گیا
۴۔ فکشن نمبر، ماہنامہ آہنگ، گیا

- **کالم نگاری :**

۱۔ ہفتہ وار بودھ دھرتی، گیا میں کئی سال تک 'ٹف نوٹس' کے عنوان سے کالم نگاری کی۔

- **علمی وسماجی خدمات:**

– دی کلچرل اکادمی، گیا کا قیام
– (اپنی رہائش، رینہ ہاؤس، جگجیون روڈ، گیا، میں)
– اس اکادمی کے زیر اہتمام متعدد اہم ادیبوں کی کتابیں شائع ہوئیں، ادبی جلسوں مذاکروں کا اہتمام کیا گیا اور ادیبوں کو اعزاز سے نوازا گیا۔
– صوبہ بہار میں ترقی پسند تحریک کے فروغ کے لیے مسلسل کوشاں رہے اور اس تحریک کے سرگرم رکن رہے۔
– انجمن ترقی اُردو، بہار میں بھی سرگرم رہے اور اس انجمن کے جنرل سکریٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔
– شہر گیا میں دو کالجوں کے قیام میں نمایاں کردار ادا کیا۔
– شہر گیا میں اُردو گرلس مڈل اور اُردو گرلس ہائی اسکول کے قیام میں بنیادی رول ادا کیا۔
– متعدد تعلیمی اداروں اور سماجی تنظیموں میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔

- **انتقال** : ۲؍فروری ۱۹۹۴ء، رات گیارہ بج کر بیس منٹ، گیا (بہار)
- **تدفین** : ۳؍فروری ۱۹۹۴ء بھٹ بیگہ قبرستان، گیا (بہار)

☆☆☆

کلام حیدری: سوانح اور شخصیت

اردو کی ادبی وتہذیبی تاریخ میں کلام حیدری کا نام بے حد اہم اور ممتاز ہے۔ ان کی شناخت برصغیر کے نامور افسانہ نگاروں اور صحافیوں میں کی جاتی ہے۔ وہ صوبہ بہار کے معروف صنعت کار اور ترقی پسند نظریے کے حامل اہم فرد تھے۔ ہفتہ وار 'مورچہ' اور ادبی ماہنامہ 'آہنگ' شہر 'گیا' (بہار) سے ان کی ادارت میں برسوں تک نکلتا رہا جس نے اردو دنیا میں خاص مقام حاصل کیا۔ کلام حیدری نے اپنی کوٹھی 'رینا ہاؤس' میں دی کلچرل اکیڈمی گیا کا قیام کیا جس کے تحت برسوں متعدد علمی وادبی جلسوں و مذاکروں کا انعقاد کیا جاتا رہا۔ ملک کے معروف ادیبوں کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوئیں۔ کلام حیدری خوش شکل، خوش مزاج، خوش لباس، اور بے حد دلآویز شخصیت کے حامل انسان تھے۔ ان کی پوری زندگی بڑے ہی آب وتاب اور پروقار انداز میں بسر ہوئی۔ ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی سیمابیت تھی۔ دولت کی فراوانی کی وجہ سے ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی تمکنت بھی در آئی تھی مگر وہ ادیبوں، شاعروں اور سبھی فنکاروں کے بڑے قدر دان تھے۔ ان کی زندگی کے متعدد روشن پہلو تھے جن کا ذکر ان کے غیاب میں ان کے احباب اکثر کرتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا جن سے وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ اپنے خاندان، رشتہ داروں، بیگم، بیٹی، داماد اور نواسیوں سے بھی انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کی پوری زندگی جدوجہد سے بھری رہی۔ مسائل ومصائب کا انھوں نے ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا اور ہمیشہ کامیابی حاصل کی۔

کلام حیدری کا اصل نام محمد کلام الحق حیدر تھا۔ ان کا وطن مردم خیز بستی پچنہ شیخ پورہ مونگیر (بہار) تھا۔ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ ان کے پردادا امیر حیدر وکیل کا دبدبہ پورے علاقے میں تھا۔ ان کی پروقار شخصیت اور علم دوستی کے چرچے پورے علاقے میں تھے۔ امیر حیدر وکیل کے صاحبزادے مولوی کریم وکیل تھے جو کلام حیدری کے دادا تھے۔ کلام حیدری کے والد محمد انعام الحق ایک

پولیس آفیسر تھے اوران کی والدہ نورالعین صاحبہ ایک خداترس نیک دل خاتون تھیں۔ کلام حیدری کی پیدائش ان کی نانیہال قصبہ چوارہ کے نزدیک موضع رانکڑ، ضلع مونگیر، بہار میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش کے بارے میں اختلاف ہے۔ کلام حیدری نے اپنے چوتھے افسانوی مجموعے ’گولڈن جبلی‘ کے آخری صفحات میں اپنی مختصر خودنوشت بعنوان ’اپنی زندگی کے کچھ سچ‘ میں یہ لکھا ہے کہ ’’میری ماں نے بتایا ہے کہ میں جولائی ۱۹۳۰ء‘‘ میں پیدا ہوا جبکہ ماہنامہ ’سہیل‘ گیا کے کلام حیدری نمبر میں ان کی تاریخ پیدائش ۲؍اپریل ۱۹۳۰ء درج ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے اپنی کتاب ’بہار میں اردو افسانہ نگاری (ابتدا تا حال) میں صرف ۱۹۳۰ء درج کیا ہے۔ میرے خیال میں یہ تمام تاریخیں قیاس پر مبنی ہیں۔ کلام حیدری کی ماں نے انھیں صرف جولائی ۱۹۳۰ء ہی بتایا ہے۔ اس میں تاریخ پیدائش درج نہیں ہے۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ تمام حوالوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۹۳۰ء میں ان کی نانیہال موضع رانکڑ ضلع مونگیر (بہار) میں ہوئی تھی۔

کلام حیدری کے نانا ڈاکٹر علی حسن قصبہ جلیسر ضلع ایٹہ (اترپردیش) میں مقیم تھے جو پیشے سے ڈاکٹر تھے۔ وہ ایک دیندار اور مذہبی انسان تھے۔ ان کی شرافت، نیکی اور بحیثیت ایک اچھے ڈاکٹر ان کی جلیسر اور اطراف میں بڑی شہرت تھی۔ ان کا ادبی ذوق بھی بالیدہ تھا۔ انھیں مطالعے کا حد درجہ ذوق تھا۔ کلام حیدری کی ابتدائی تعلیم انھیں کے زیرسایہ پانچ برس سے بارہ برس تک محلّہ نوشیان جلیسر میں ہوئی۔ جہاں ان کے نانا روزانہ رات میں تذکرۃ الانبیا سے نبیوں کے حالات اور ان کے معجزات وغیرہ سنایا کرتے تھے۔ ان کے نانا شام میں انھیں الف لیلیٰ کے قصے اور شاہنامہ بھی پڑھ کر سناتے جس سے کلام حیدری کا ذوق بالیدہ ہوتا گیا۔ قصوں، ان کے مکالموں اور کرداروں میں ان کی خاص دلچسپی تھی۔ کلام حیدری نے جلیسر میں اپنے نانا کے ساتھ گزارے ہوئے خوشگوار ایام کا ذکر اپنے انٹرویو اور خودنوشت سوانح میں بھی بڑے ہی جذباتی انداز سے کیا ہے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اخبار و رسائل بالخصوص روزنامہ ملت، مدینہ اور ندوہ سے شائع ہونے والے صدق کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کے جلیسر کے استاد مولوی اللہ بخش تھے جنھوں نے کلام حیدری کو حالی کی نظمیں ازبر کروادی تھیں۔ اس زمانے میں شفیع الدین نیر کی نظمیں بھی بہت مقبول ہو رہی تھیں۔ کلام حیدری نے ان کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کے استاد اللہ بخش نے ان سے تختی لکھوائی اور چکرورتی کی کتاب علم الحساب، اردو میں شروع سے آخر تک پیٹ پیٹ کر انھیں پڑھا دیا۔ اختر منزل، محلّہ نوشیان، جلیسر

کی وسیع عمارت، وہاں کی پرفضا آب و ہوا اور رچی ہوئی تہذیب کا اثر کلام حیدری کی ذات پر ایسا پڑا کہ وہ تاعمر اسے بھلا نہیں سکے۔ جلیسر سے اپنے وطن مونگیر واپسی کے بعد کلام حیدری نے ایک دو سال تک گھر پر ہی تعلیم حاصل کی اس دوران انھوں نے انگریزی زبان کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا اور پھر مسلم ہائی اسکول، پٹنہ میں ان کا داخلہ آٹھویں کلاس میں کرایا گیا۔ آٹھویں کلاس پاس کرنے کے بعد رام موہن رائے سمینری، پٹنہ میں نویں کلاس میں انھوں نے داخلہ لیا۔ اسکول کے زمانے میں انھیں اردو رسائل وجرائد کے مطالعے کا شوق پیدا ہوا۔ وہ پابندی سے گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ میں صبح سے شام تک افسانوں، ناولوں، داستانوں، کی کتابیں پڑھتے۔ رسائل و جرائد سے چن چن کر افسانے پڑھتے۔ ۱۹۴۲ء کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کی مخالفت ملک میں شدید سے شدید تر ہوگئی تھی۔ انگریزوں کے ظالمانہ اور متعصّبانہ رویے سے ہر کوئی نالاں تھا۔ غلامی کی زنجیر میں جکڑے کروڑوں ہندوستانی آزادی کے خواہاں تھے۔ ان ہی آزادی کے متوالوں میں ایک نام کلام حیدری کا تھا۔ ۱۹۴۲ء میں پٹنہ کے الفسٹن سنیما ہال میں فضلی برادری کی فلم ’چورنگی‘ کا میٹنی شو ہو رہا تھا کہ انقلابیوں کا ایک جلوس سنیما ہاؤس میں داخل ہوگیا اور پورا ہال انقلاب زندہ باد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ کلام حیدری بھی انقلابیوں کے ساتھ ترنگا جھنڈا ہاتھ میں لے کر باہر آئے تو اس وقت تک پورا علاقہ پولیس کی چھاؤنی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ٹامیوں نے پورے پٹنہ شہر میں اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ کلام حیدری کسی طرح بچ کر اپنے کمرے تک پہنچے۔ صبح جب وہ رام موہن رائے سمینری پہنچے تو دونوں گیٹوں پر طلبا کا جلوس تھا اور گیٹ بند تھے۔ کلام حیدری نے ایک بڑے پتھر سے گیٹ کے ایک تالے کو مار مار کر توڑ دیا۔ گیٹ کھل گیا اور ہزاروں طلبا کلام حیدری کے پیچھے پیچھے اسکول میں داخل ہو گئے۔ یہ طلبا وہ تھے جو آزادی کے لیے بےقرار تھے۔ دوسرے دن سے ہی پٹنہ میں انقلابیوں کی گرفتاری شروع ہوگئی۔ کلام حیدری پٹنہ سے بھاگ کر مونگیر ضلع کے ایک گاؤں بربگہا میں روپوش ہو گئے۔ وہ کئی مہینے اپنی نانیہال رانکڑ ضلع مونگیر اور ملک چک میں چھپے رہے۔ ملک چک میں ان کی خالہ کا گھر تھا۔ ان کی خالہ اردو فارسی کے علاوہ تاریخ پر بھی عبور رکھتی تھیں۔ ادب کا ان کا ستھرا ذوق تھا۔ زبان پر بھی عبور رکھتی تھیں۔ وہاں انھیں ان کی بے حد محبت کرنے والی شاہدہ باجی بھی ملیں۔ ملک چک کے قیام کے دوران کلام حیدری کے علمی و ادبی ذوق میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ جب وہ پٹنہ واپس آئے تو انھیں معلوم ہوا کہ انھیں رام موہن رائے سمینری سے نکال دیا گیا لہٰذا انھوں نے پٹنہ مسلم اسکول سے اپنا نام بدل کر پرائیویٹ طور پر نویں درجہ کا ا

متحان دیا۔ کلام حیدری نے ۱۹۴۵ء میں پٹنہ مسلم ہائی اسکول سے ہی میٹرک (دسویں) کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانے میں میٹرک کا امتحان بھی پٹنہ یونیورسٹی کے تحت ہی ہوا کرتا تھا۔ پٹنہ میں اسکول کی تعلیم کے دوران ہی کلام حیدری نے گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ میں صبح وشام تک اردو کے شاہ کارناولوں اور کہانیوں کا بھی مطالعہ کیا۔ انھوں نے تیرتھ رام فیروز پوری کے تمام جاسوسی ناول شہاب کی سرگزشت (نیاز فتح پوری)، شکست و فتح (جمیل مظہری) اس کے علاوہ جمالستان، نگارستان، شمیم، انور وغیرہ کا مطالعہ اسی لائبریری میں بیٹھ کر کیا۔ قیام پٹنہ کے دوران اُن کی دوستی منظور عالم نام کے ایک لڑکے سے ہوگئی۔ منظور عالم کے چچا رحمت علی صابر نور محلوی تھے جو ریلوے میں ملازم تھے۔ رحمت علی صاحب افسانہ نگار تھے اور ان کی کہانیاں پاکستان کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے یہاں کثرت سے اخبارات ورسائل آتے تھے۔ کلام حیدری ان رسائل کو بھی ذوق وشوق سے پڑھتے رہے۔ ان دنوں کلام حیدری کے والد کی پوسٹنگ بھی داناپور ریلوے اسٹیشن کے قریب تھانے میں تھی۔ اس لیے وہ اپنے دوست منظور عالم کے ساتھ ان کے چچا رحمت علی صاحب کے گھر اکثر جایا کرتے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد کلام حیدری کلکتہ پہنچے اور انھوں نے وہاں رِپن کالج میں انٹرمیڈیٹ آف کامرس میں داخلہ لیا۔ رپن کالج سے انھوں نے ۱۹۴۷ء میں آئی کام پاس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے سینٹ زیویرس کالج، کلکتہ میں تھرڈ ایئر کامرس میں داخلہ لیا۔ کلکتہ سے ہی انھوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ 'نغمہ ونور' کے نام سے ایک ماہنامہ نکالنا شروع کیا۔ مگر جلد ہی ان دونوں کا اختلاف ہوگیا اور کلام حیدری نے اس رسالے سے علیحدگی اختیار کی۔ اس زمانے میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) جانے کے لیے کسی ویزا پرمٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ ۱۹۴۷ء میں کلام حیدری رنگ پور جا پہنچے اور انھوں نے اسٹیشن کے سامنے ایک ریستورانت کھولا جس میں انھوں نے بنگال کی تہذیب کا خاص خیال رکھا۔ ان کا ریستورانت گھاس پھوس کی چھت اور بانس کی دیواروں کا بنا ہوا تھا۔ ریستورانت چل نکلا مگر ریستورانت کی الجھنوں کی وجہ سے انھوں نے اس کام کو چھوڑ دیا اور ایک سنیما ہال میں سنیما آپریٹری سیکھنا شروع کردیا۔ سنیما ہال کے مالک پشاروی خان، کلام حیدری کی سنجیدگی اور لگن سے متاثر ہوئے اور انھیں سنیما ہال کا منیجر بنا دیا۔ کلام حیدری کی خواہش تھی کہ وہ اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ انھوں نے رنگ پور کالج میں داخلہ لینا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس کالج میں نوے فی صد اساتذہ غیر مسلم تھے جو بدلتے ہوئے حالات

کی وجہ سے رنگ پور چھوڑ کر چلے گئے اور کالج بند تھا۔ کچھ دنوں کے بعد انھیں یہ علم ہوا کہ ملک تقسیم ہونے کی صورت میں ہندوستان سے پاکستان آنے جانے کے لیے پرمٹ کی ضرورت ہوگی۔ کلام حیدری خالص ہندوستانی تھے، وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے، مشرقی پاکستان کی شہریت قبول کرنا انھیں بالکل گوارہ نہیں تھا۔ انھوں نے فوراً یہ ارادہ کرلیا کہ وہ رنگ پور کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیں گے۔ انھوں نے اچانک رنگ پور چھوڑ دیا اور اپنے والد کے پاس رانچی آگئے اور یہیں انھوں نے تھرڈ ایئر آرٹس میں داخلہ لیا۔ علمی وادبی اعتبار سے رانچی کا ماحول ان دنوں خاصا اچھا تھا۔ کلام حیدری کی ملاقات اختر پیامی سے ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کلام حیدری انجمن ترقی پسند مصنّفین، اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے قریب تر ہوگئے۔ ان کی مجلسوں، محفلوں، پروگراموں اور کانفرنسوں میں باقاعدہ شریک ہونے لگے۔ وہ ۲۴ رجنوری ۱۹۵۰ء کی شب گرفتار بھی ہوئے۔ انھیں جیل میں نہیں بلکہ سیل میں بند کر کے رکھا گیا۔ واضح ہو کہ ۱۹۴۹ء میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کی بھیمڑی میں جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں رانچی سے دو مندوبین نے شرکت کی تھی جن میں ایک کلام حیدری تھے۔ رانچی میں کلام حیدری کا سیاسی شعور مزید بالیدہ ہوا۔ انھوں نے رانچی کالج، رانچی سے ۱۹۵۰ء میں بی اے اردو میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔ ان دنوں پورے بہار میں صرف ایک ہی یونیورسٹی پٹنہ یونیورسٹی تھی۔ ایم اے اردو میں داخلہ کے لیے کلام حیدری ستمبر ۱۹۵۰ء میں پٹنہ آئے اور انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔

پٹنہ شہر اُن دنوں پورے بہار میں علم وادب کا اہم مرکز تھا جہاں اس زمانے میں اردو کے ممتاز ادیب اور فنکار جمع تھے۔ پٹنہ یونیورسٹی میں اچھے اساتذہ اور اچھی لائبریری تھی۔ وہاں انھیں اچھے احباب بھی ملے۔ ان کے کلاس فیلو میں انور عظیم، منظر شہاب بھی تھے۔ کلام حیدری نے ۱۹۵۲ء میں ایم اے اردو میں پٹنہ یونیورسٹی میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی۔ اختر اورینوی صاحب ان دنوں پٹنہ یونیورسٹی، شعبۂ اردو کے صدر تھے۔ بیشتر طلبا کی خواہش ہوتی تھی کہ انھیں پٹنہ یونیورسٹی میں لکچرر کے عہدے کے لیے منتخب کرلیا جائے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی میں اتنی گنجائش بھی نہیں تھی۔ نتیجتاً کلام حیدری کو پٹنہ شہر کو خیر باد کہنا پڑا اور انھوں نے ۱۹۵۲ء میں ہی پورنیہ کالج، پورنیہ میں بحیثیت اردو لکچرر جوائن کیا۔ پورنیہ میں انھیں وفا ملک پوری جیسے مخلص دوست اور کرم فرما ملے۔ دونوں کی محبتیں، اپنائیت اور خلوص پر مبنی رشتے کی مثال دی جاسکتی ہے۔ وفا ملک پوری ان دنوں ادبی رسالہ 'صبح نو' نکالا

کرتے تھے۔کلام حیدری ان کے شریک کار ہو گئے ۔ پورنیہ میں قیام کے دوران ہی ان کا پہلا افسانوں کا مجموعہ 'بے نام گلیاں' شائع ہوا۔ پورنیہ میں انھوں نے نکہت کلب الہ آباد کی ایک شاخ قائم کی ۔ نئے لکھنے والوں کو جمع کیا۔انھوں نے نکہت کلب پورنیہ شاخ کے زیر اہتمام ۱۹۵۳ء میں بڑے ہی تزک و احتشام سے آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد کیا۔نکہت کلب کی باضابطہ نشستیں ہونے لگیں جس میں شعری ونثری تخلیقات پیش کی جاتیں، ان پر تبصرے ہوتے ۔ ان دنوں شمس جمال، انتظار عالم، طلعت محمود، صدرالعالم وغیرہ باقاعدہ ان نشستوں میں شامل ہوتے ۔ اردو کے علاوہ ہندی اور بنگلہ زبان کے ادیب بھی کلام حیدری کی کھپر پوش رہائش گاہ پر اکثر جمع ہوتے اور ادبی مباحث کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ان سبھی محفلوں میں کلام حیدری کی حیثیت مرکزی ہوتی۔

کلام حیدری کی شادی ۱۹۵۶ء میں شہر گیا کے معروف ڈاکٹر اور متمول شخصیت ڈاکٹر ابوالخیر کی صاحب زادی شاہدہ حیدری سے ہوئی۔ اس شادی نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اپنے خسر محترم کے مشورے سے انھوں نے شہر گیا کے بیراگی محلے میں ۱۹۵۶ء میں کنکریٹ پائپ بنانے کا کارخانہ قائم کیا۔ اس دوران انھوں نے کالج سے دو سال کی چھٹی لے لی اور ۱۹۵۸ء میں پورنیہ کالج کے شعبۂ اردو کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ وہ اس کالج سے استعفیٰ دے کر باقاعدہ گیا آ بسے، گویا کہ کلام حیدری ایک استاد سے اب باقاعدہ صنعت کار بن گئے ۔کلام حیدری میں تاجرانہ صلاحیتیں بے پناہ تھیں ۔ان کے کاروبار کو بے پناہ فروغ حاصل ہوا اور وہ صرف گیا کے ہی نہیں بلکہ صوبہ بہار کے اہم صنعت کاروں میں شمار کیے جانے لگے ۔ ان سب کے باوجود ان کا ادبی ذوق وشوق جاری وساری تھا۔ کاروبار سے وقت نکال کر وہ مطالعے میں منہمک رہتے ۔انھوں نے اپنی ایک شاندار ذاتی لائبریری قائم کی جس میں نادر ونایاب کتابیں یکجا کیں ۔

۱۹۵۸ء میں اللہ نے انھیں ایک بیٹی عطا کی جس کا نام انھوں نے نگارینہ حیدری رکھا۔ اسی دوران انھوں نے شہر گیا کے سب سے خوبصورت علاقے جگ جیون روڈ پر سرکٹ ہاؤس کے سامنے ایک شاندار کوٹھی بنائی۔ جس کا نام اپنی بیٹی کے نام پر 'رینا ہاؤس' رکھا۔کلام حیدری کی رہائش گاہ نہایت کشادہ اور فن تعمیر کا عمدہ نمونہ تھی ۔ اب کلام حیدری کی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمی کا مرکز شہر گیا بن چکا تھا۔ انھوں نے گیا سے ہی ۱۹۶۳ء میں ہفتہ وار مورچہ اور دو تین سال بعد ادبی ماہنامہ 'آہنگ' نکالنا شروع کیا۔ 'مورچہ' اور 'آہنگ' کو اردو کے صحافتی ادب میں بلند مقام حاصل ہوا۔ ان دنوں ان میں شائع ہونے والے

اداریوں اور تبصروں کی بازگشت دور تک سنائی دی۔ کلام حیدری بیباک، نڈر اور صاحب نظر صحافی تھے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی سیاست پر ان کی گہری نظر تھی۔ اردو ادب تو ان کا اوڑھنا، بچھونا تھا ہی، ان دونوں اخبار ورسالے نے علمی وفکری سطح پر خاص تبدیلی لانے میں موثر کردار ادا کیا۔

کلام حیدری نے اپنی صاحبزادی نگارینہ حیدری کی شادی افسیر احمد سے بڑی آن بان اور شان سے کی ۔ نگارینہ حیدری ان کی اکلوتی اولاد تھیں جن سے وہ بے پناہ پیار کرتے تھے ۔ افسیر احمد پیشے سے انجینئر تھے اور دہلی میں مقیم تھے ۔ان کی بیٹی جب دہلی میں رہنے لگی تو اس کی جدائی سے کلام حیدری کا دل بے چین ہونے لگا۔ اب ان کا دل گیا میں نہیں لگتا۔ وہ اکثر دہلی میں ہی رہتے ۔'مورچہ' تو بند ہو چکا تھا۔ 'آہنگ' بھی اب پابندی سے شائع نہیں ہوتا۔ انھوں نے ارادہ کیا تھا کہ 'آہنگ' کو آفسیٹ پر وہ دہلی سے دوبارہ نہایت اہتمام سے شائع کریں گے مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ اب ان کی زندگی میں ان کی دونواسیاں آفرین احمد اور سارہ احمد بھی آ چکی تھیں ۔نواسیوں کی آمد سے ان کے دل کی دنیا جگمگا گئی۔ بیٹی، داماد اور نواسیوں کے بغیر اُن کا وقت گزارنا مشکل تھا۔ اسی دوران نوئیڈا میں ایک شاندار کوٹھی تعمیر ہونے کے بعد ان کی بیٹی اور داماد وہاں رہنے لگے تو کلام حیدری بھی اپنا زیادہ وقت اب گیا کی بجائے نوئیڈا میں ہی گزارتے ۔ گیا سے انھیں خاص لگاؤ اور قربت تھی ۔ یہاں کے اعزہ واحباب کی انھیں جب بھی یاد ستاتی گیا آجاتے اور پھر نوئیڈا بیٹی اور داماد کے پاس چلے جاتے ۔

۲رنومبر ۱۹۹۲ء کو کلام حیدری کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ ان دنوں وہ دہلی میں مقیم تھے۔ آناً فاناً میں انھیں پاس کے ایک ہاسپٹل میں بھرتی کرایا گیا۔ سبھی ڈاکٹر ناامید تھے پھر بھی فرسٹ ایڈ کے بعد ان لوگوں نے اسکارٹ ہارٹ ہاسپٹل میں لے جانے کا مشورہ دیا۔ کلام حیدری کا اسکارٹ ہارٹ ہاسپٹل میں علاج شروع ہو گیا۔ ان کے دل کی حالت کافی خراب تھی ۔ تین چار مہینے کے بعد جب ان کی صحت اچھی ہو گئی، طاقت آ گئی تو مشہور ہارٹ سرجن ڈاکٹر نریش تراہن نے ۲۴ رفروری ۱۹۹۳ء کو ان کے دل کا آپریشن کیا۔ ڈاکٹر تراہن نے کہا تھا کہ یہ ایک مشکل آپریشن تھا اور اس لیے انھیں اچھا ہونے میں تھوڑا وقت لگے گا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اسپتال سے گھر آ گئے ۔ آہستہ آہستہ ان کی طبیعت بشاش ہونے لگی۔ اِس دوران انھوں نے اپنے دوستوں کو متعدد خط لکھے اور اپنی صحت اور آپریشن کے بارے میں انھیں بتایا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ پورے طور پر صحت یاب ہو چکے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے ملاقات کی اُن کی بڑی

خواہش رہتی۔ ڈاکٹروں نے انھیں بتادیا کہ اب انھیں کوئی خطرہ نہیں تو انھوں نے گیا کے سفر کا قصد کیا۔ گیا آتے ہی ان سے محبت کرنے والے ٹوٹ پڑے۔ اب روزانہ شام میں حسب سابق ملاقاتوں کا ایک سلسلہ رہتا۔ وہ خود بھی دوسروں کے یہاں جا جا کر ملاقاتیں کرتے۔ وہ اکثر اپنی بیگم سے کہتے کہ میری طبیعت اندر سے اچھی نہیں ہے۔ میں خود کو بہتر نہیں پاتا ہوں مگر ان کی بیگم شاہدہ حیدری صاحبہ انھیں دلاسا دیتیں۔ وہ کچھ پریشان رہتے اور مایوسی کی باتیں بھی کرنے لگتے۔

۲؍فروری ۱۹۹۴ء کو پورا دن اچھا گزرا۔ شام میں کلام حیدری کی رہائش گاہ پر پروفیسر علیم اللہ حالی ان سے ملاقات کے لیے تشریف لائے ان کا ایک طویل انٹرویو لیا۔ ان کی زندگی اور ادب کے مختلف نکات پر کلام حیدری نے بھرپور گفتگو کی۔ ان کے جانے کے بعد کلام حیدری صاحب نے اپنی بیگم کے ساتھ کھانا کھایا۔ سونے سے قبل وہ باتھ روم گئے وہاں سے واپس آئے تو پسینے میں شرابور تھے۔ وہ بستر پر لیٹ گئے۔ ان کی اس کی کیفیت کو دیکھ کر ان کی بیگم کو اندازہ ہوگیا کہ یہ دل کا دورہ ہے۔ انھوں نے فوری طور پر اپنے رشتہ داروں کو فون کیا، وہ سبھی آگئے۔ انھیں گیا کے ایک اسپتال میں لے جایا گیا۔ مگر اس اسپتال میں وہ انتظامات نہیں تھے جو بڑے اسپتالوں میں ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۲؍فروری ۱۹۹۴ء کی رات، گیارہ بج کر بیس منٹ پر کلام حیدری نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی، داعی اجل کو لبیک کہا اور سبھی پرسان حال افراد کو داغِ مفارقت دے گئے۔ ۳؍فروری ۱۹۹۴ء کو گیا کے بھٹ بیگھہ قبرستان میں انھیں دفن کیا گیا۔ ان کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہوکر جناب فرحت قادری نے ایک نظم 'قلم کا مجاہد' لکھی جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک مجاہد تھا قلم کا، وہ کلام حیدری
اس کی بے باکی میں تھی تاثیر نام حیدری
اک صحافی اک مقرر، ایک افسانہ نگار
ایک شخصیت میں ساری خوبیاں تھیں شاہ کار
وہ فسانوں کا تھا شہزادہ قلم کا بادشاہ
رکھتا تھا سارے ادب پر جو بصیرت کی نگاہ

کلام حیدری کی شخصیت میں غضب کی کشش اور دلآویزی تھی۔ قدرت نے انھیں دنیوی دولت

سے مالا مال کیا تھا۔ وہ شائستہ، روادار، بذلہ سنج، دوستدار، مہمان نواز، ادب دوست، خوش پوش اور حسین و جمیل انسان تھے۔ ادب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا اور صحافت سے انھیں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ ادبی ماہنامہ 'آہنگ' گیا اور ہفتہ وار 'مورچہ' کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ وہ ایک ذی حیثیت اور ذی علم انسان تھے۔ ان کے یہاں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ وہ ایک بڑے کاروباری ضرور تھے مگر مشرقی تہذیب میں ایسے رچے بسے انسان تھے کہ جو شخص بھی ان سے ملتا، گفتگو کرتا، ان کا فریفتہ ہو جاتا مگر انھیں غصہ بھی جلد آتا تھا، وہ کب، کس سے اور کس بات پر ناراض ہو جائیں گے اسے سمجھنا مشکل تھا۔ انانیت ان کی ذات کا حصہ تھی جس نے انھیں بڑا نقصان پہنچایا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کے باوجود اکثر جوش میں آکر دفعتاً کسی کے بارے میں کچھ ایسا کہہ جاتے یا کچھ ایسا عمل کر جاتے کہ سامنے بیٹھا شخص ششدر رہ جاتا۔ جس سے ان کی شخصیت مجروح ہو جاتی تھی۔ کلام حیدری کی ذات و صفات کے مطالعے اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے اور جاننے کے لیے تحلیل نفسی کی ضرورت ہے۔ آخر علم و حلم، شرافت و وضع داری سے بھرا پُرا انسان اچانک دوسروں پہ حملہ آور کیوں ہو جاتا تھا۔ قدرت نے انھیں بے شمار نعمتوں سے نوازا تھا مگر بیشتر ان کے اپنے بھی اپنے نہ ہو سکے۔ ان کے مخالفین کی تعداد زیادہ تھی مگر ان میں سے اکثر ان کے حاسدین تھے۔ یا وہ لوگ جن کی توقع کلام حیدری پوری نہ کر سکے۔ رسائل کا نکالنا یوں بھی مشکل کام ہے، سب کو خوش نہیں کیا جا سکتا اور کون کب ناراض ہو جائے یہ کہنا مشکل ہے۔ کلام حیدری اپنے بارے میں خود لکھتے ہیں:

''اللہ کے بہت کچھ دینے پر مجھے دوست نما لوگوں سے دشمنی، حسد، جلن بھی ملا۔ مجھ کو ہاتھ پکڑ کر اوپر اٹھایا، اس نے مجھے نیچے ہی گھسیٹنے کی کوشش کی اور یہ نہ سوچا کہ ان بازوؤں میں بندۂ علی کی قوت بھی تو ہوگی۔

نانا ڈاکٹر۔ انہوں نے مجھے قناعت پسندی اور انکسار بخشا۔

ماموں ڈاکٹر۔ انہوں نے غلط بات کو سیدھے غلط کہنے کی عادت ڈال دی۔

اور سوچنے کی ایسی عادت خود بخود پڑ گئی کہ دنیا سوتی ہو تو میں گھنٹوں آنکھیں بند کیے بستر پر تکیہ لگائے سوچتا رہتا ہوں۔ ہر بات کی

اپنی توجیہہ۔ ہر بات کی اپنی تشریح، ہر بات کی اپنی توضیح۔

دوست نما لوگ پریشان، نہ حسد سے ڈرتا ہے، نہ دشمنی سے ڈرتا ہے۔ نہ دشمنی سے خوف کھاتا ہے اور صحیح کو صحیح 'فراز دار' پہ کہہ دیتا ہے۔ اپنے سراسیمہ، روپے کماتا ہے اور بے دریغ خرچ کرتا ہے اور کبھی اس کا کوئی کام رکتا نہیں تھا۔ پہاڑے سب جانتا ہے مگر جوڑ گھٹاؤ نہیں کرتا بس جیئے جاتا ہے۔ سڑکیا ہوٹل سے لے کر فائیو اسٹار ہوٹل تک روندتا رہتا ہے۔ کھادی، ہینڈلوم کے کُرتے پائجامے میں کلام حیدری لگتا ہے۔ قیمتی سے قیمتی کپڑوں نے بھی کلام حیدری کو نہیں پہنا ہے۔ اسکول کالج کے ساتھی سے بڑھ کر کسی کو دوست مانتا ہے تو بس اپنی برادری کے ہی لوگوں کو— یعنی ادیب، شاعر اور وہ جو پڑھے لکھے ہیں۔ کوئی پوچھے کیوں؟ اسکول کالج کے ساتھی بچوں کی معصومیت کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ پڑھنے لکھنے والوں سے سیکھنے اور جاننے کے لیے ملتا ہے۔''

(ماہنامہ سہیل گیا، کلام حیدری نمبر، شمارہ ۱۰، جلد ۵۶، ص ۱۸، ۱۹)

کلام حیدری کی بیباکی، بے خوفی، حق گوئی اور راست گوئی نے بہتوں کو زخمی کیا۔ ان کا غیر منافقانہ اور غیر مصلحت آمیز رویہ ہمیشہ حاوی رہا۔ وہ اپنی تلوار ہمیشہ میان سے باہر رکھتے تھے اور موقع ملتے ہی نہایت ہی سرعت سے حملہ آور ہوتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر وہ ان افراد کو بھی زخمی کر دیتے تھے، جو ان کے مداح، رفیق اور غمگسار تھے۔

کلام حیدری علم و ادب کے قدرداں تھے۔ وہ اردو زبان و ادب کے متوالے، شیدائی اور پرستار تھے جس کا اظہار وہ ہمیشہ اپنی تحریروں میں کرتے تھے۔ رسالہ ماہنامہ 'آہنگ' اور ہفتہ وار 'مورچہ' کی اشاعت اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ انھوں نے ادب و ثقافت کے فروغ کے لیے 'دی کلچرل اکیڈمی' گیا کا بھی قیام عمل میں لایا تھا جس کے تحت متعدد اہم ادیبوں اور دانشوروں کی کتابیں اس اکیڈمی سے شائع ہوئیں۔ وہ اپنے دولت کدے پر علمی و ادبی محفلیں آراستہ کرتے، نئے سال کا جشن نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ شعرا و ادبا کے ساتھ مناتے۔ ملک کے مایہ ناز ادیبوں کی میزبانی کرتے۔ ان کے لیے محفلیں سجاتے،

علمی و ادبی مذاکروں کا انعقاد کرتے، تخلیقی فنکاروں کو بطور خاص مدعو کرتے، ان کی قدردانی کرتے۔ نئے فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتے۔ 'آہنگ' میں جس طرح انھوں نے نئے فنکاروں کا تعارف کرایا، ان کے فن کی داد دی، جس کی وجہ سے ان فنکاروں کی خاص شہرت ہوئی، اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

کلام حیدری کا دولت کدہ 'رینا ہاؤس' اس زمانے میں شاعروں اور ادیبوں کی آماجگاہ تھا۔ ان کی میزبانی کی شہرت دور دور تک تھی۔ وہ بیرونی مہمانان کو بطور خاص مدعو کرتے۔ ان مہمانوں کا قیام کئی کئی دن بھی رہتا۔ مہمانوں کی آمد سے اُن کے دولت کدے اور شہر کی چہل پہل بڑھ جاتی۔ ان کے اعزاز میں وہ جلسے منعقد کرتے جس میں بڑی رونق رہتی۔ ایک جشن کا سماں رہتا۔ سجاد ظہیر، احتشام حسین، اعجاز حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، حسن نعیم، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی، عقیل رضوی، جوگندر پال، راہی معصوم رضا، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، ڈاکٹر عبدالعلیم، مظہر امام وغیرہم نے کلام حیدری کی دعوت و محبت میں گیا کا سفر کیا، 'رینا ہاؤس' کی محفلوں کو رونق بخشی اور ان کے مہمان ہوئے۔ وہ زمانہ بھی عجیب تھا۔ شہر گیا کا تصور بغیر کلام حیدری کے مکمل نہیں تھا۔ دور دراز کے شعرا و ادبا نہ صرف ان سے غائبانہ طور پر متعارف تھے بلکہ ان سے ملاقات کے خواہاں رہتے۔ اس لیے جب بھی کسی ادیب کی گیا آمد ہوتی، کلام حیدری سے وہ ضرور ملاقات کرتے۔

ادب کے ساتھ ساتھ سیاست بھی کلام حیدری کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ سیاسی پروگراموں میں کثرت سے جاتے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ کانگریس کے رہنماؤں سے بھی ان کا اچھا رشتہ تھا۔ ایک زمانے میں یہ بھی مشہور ہوا کہ کلام حیدری باقاعدہ عملی سیاست میں حصہ لینا چاہتے ہیں اور الیکشن لڑنا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے انھوں نے ٹکٹ کے لیے کوشش کی ہو اور انھیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہو یا پھر یہ کہ انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا اور باقاعدہ الیکشن لڑنا مناسب نہیں سمجھا مگر وہ مختلف جلسوں اور سرکار مخالف احتجاجوں میں پابندی سے شریک ہوتے۔ ولولہ انگیز تقریریں کرتے اور عوامی جلسوں کو کامیاب بنانے میں بھرپور مدد کرتے۔

کلام حیدری کے یہاں سماجی خدمت کا جذبہ بھی غالب تھا۔ شہر گیا میں انھوں نے اقلیتوں کے لیے اردو گرلس مڈل اور ہائی اسکول کے قیام کے لیے سخت جدوجہد اور شب و روز محنت کی۔ مرزا غالب کالج گیا کے قیام میں بھی انھوں نے بھرپور تعاون دیا۔ ان دونوں اداروں نے گیا میں اقلیتوں کی تعلیم میں جو نمایاں رول ادا کیا ہے وہ غیر معمولی ہے۔ ان دونوں اداروں سے ہزاروں طالب علم تعلیم حاصل کر کے اعلیٰ

عہدوں پر فائز ہوتے رہے ہیں۔ ان دونوں اداروں کے علاوہ بھی انھوں نے مختلف تنظیموں کی سرپرستی کی۔ وہ تقریباً اٹھارہ برس تک مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا کے سینیٹ و دیگر کمیٹیوں اور کونسل کے ممبر رہے۔ کلام حیدری انجمن ترقی اردو بہار کے جنرل سکریٹری اور انجمن ترقی پسند مصنّفین کے سرگرم رکن رہے۔

کلام حیدری بیک وقت افسانہ نگار، صنعت کار، مدیر، سیاسی و سماجی کارکن تھے۔ ’آہنگ‘ اور ’مورچہ‘ وہ پابندی سے نکالتے تھے۔ شہر گیا میں ان کا اپنا ’ہند لیتھو پریس‘ بھی تھا۔ ان کی مصروفیات کا دائرہ خاصا وسیع تھا مگر ان کے یہاں ایک خاص قسم کا نظم و ضبط، اور خوش سلیقگی پائی جاتی تھی۔ سبھی کاموں کے لیے ان کا وقت طے تھا۔ ضرورتاً اس میں وہ تبدیلی بھی لے آیا کرتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک اپنے کاروبار میں مصروف رہتے اور شام سے تقریباً ساڑھے نو بجے رات تک ان کے دولت کدے پر محفلیں جمتیں۔ ادیبوں کا اجتماع رہتا۔ ان سے ملاقاتیوں کا ایک سلسلہ رہتا اور اسی دوران وہ آہنگ اور مورچہ کی ذمے داریوں کو بھی سنبھالتے۔ دوسرے شہروں سے ان کے مہمان آتے تو وہ کاروباری سلسلے سے کچھ دنوں کے لیے قطع تعلق کر لیتے۔

کلام حیدر نئے لکھنے والوں کی خوب خوب حوصلہ افزائی کرتے۔ ابھرتے ہوئے فنکاروں کے وہ قدرداں تھے۔ انھیں متعارف کرانے کا سلیقہ بھی انھیں خوب آتا تھا۔ رسالہ ’آہنگ‘ میں انھوں نے ابھرتے ہوئے فن کاروں پر گوشہ شائع کرنا شروع کیا۔ شوکت حیات، عبدالصمد، سلام بن رزاق، حسین الحق، علی امام، انور خاں پر یادگار اور شاندار گوشے شائع ہوئے جس سے ان افسانہ نگاروں کو ایک نئی شناخت ملی۔

کلام حیدری زمانۂ طالب علمی سے ہی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ وہ سجاد ظہیر کے پرستاروں میں تھے۔ احتشام حسین کے حد درجہ قدرداں تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی سے ان کی گہری دوستی تھی۔ پروفیسر اعجاز حسین، وفا ملک پوری، شاہ شکیل احمد، آل احمد سرور، محمد حسن، قمر رئیس، راہی معصوم رضا، سے بھی ان کا عقیدت و محبت کا رشتہ تھا۔ ان کے قریبی دوستوں میں غیاث احمد گدی کا نام سب سے پہلے آئے گا۔ غیاث احمد گدی کے فن کے وہ حد درجہ معترف تھے۔ ان کے علاوہ حسن نعیم، جوگندر پال، منظر شہاب، محمد مثنی رضوی، احمد یوسف، وہاب اشرفی، مظہر امام، شکیل الرحمٰن، انور عظیم، افصح ظفر، شاہد احمد شعیب، علیم اللہ حالی سے بھی ان کی گہری دوستی تھیمگر مشکل یہ بھی تھی کہ کلام حیدری صاحب کب، کس سے اور کس وجہ سے ناراض ہو جائیں گے یہ سمجھنا مشکل تھا۔ سبھی لوگ ان کے اس مزاج سے واقف تھے اس لیے محتاط رویہ اپناتے۔

کلام صاحب جب خوش ہوتے تو دل کھول کر ضرورت مندوں کی مدد کرتے اور جب ناراض ہوتے تو ان پر برس پڑتے۔ ان کے اس مزاج نے کتنوں کو ان کا مخالف بنا ڈالا۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ چند مہینوں یا برس کے بعد انھیں احساس ہوتا تو اس کا ازالہ بھی کرنے کی کوشش کرتے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔

قدرت نے انھیں بے انتہا نعمتوں سے نوازا تھا۔ مگر کوئی شے یا وجہ ایسی تھی جس کی کمی انھیں زندگی بھر ستاتی رہی۔ عزت، دولت، شہرت سب کچھ انھیں نصیب تھا لیکن ایک عجیب سی بے کلی، بے چینی ان کی ذات کے اندر ہمیشہ داخل رہی جس نے انھیں سکون سے جینے نہیں دیا۔ وہ کسی سے محبت کرتے تو اسے اپنی محبتوں کی بارش سے شرابور کر دیتے۔ وہ شخص حیران رہتا کہ اتنی مہربانی کیوں؟ مگر جب ناراض ہوتے تو حد درجہ مخالفت پر اُتر آتے۔ ان کی اس سیماب صفت کیفیت نے ان کے کئی اپنوں اور مخلصوں کو ان سے دور کر دیا اور وہ کلام حیدری کے شاکی ہو گئے۔ کلام حیدری جب کسی پر مہربان ہوتے تو اس سے ٹوٹ کر ملتے۔ زبردستی اپنا مہمان بناتے۔ خوب خاطر مدارات کرتے۔ دیر تک ان سے باتیں کرتے، اپنی کہانیاں سناتے۔ اپنے خاص حلقۂ احباب میں انھیں شامل کر لیتے۔ آہنگ میں ان کی تخلیقات شائع ہوتیں، مضامین چھپتے مگر کسی وجہ سے ناراض ہو گئے تو ایک جھٹکے میں سارا رشتہ ختم کر ڈالتے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کان کے حد درجہ کچے تھے۔ انھیں کوئی بھی شخص آسانی سے کسی کے خلاف بھڑکا سکتا تھا وہ فوری طور پر اس کی باتوں پر یقین کر لیتے۔ ادب، سماج، سیاست کا بالغ نظر اتنا عظیم انسان اکثر معمولی معمولی باتوں پر روٹھ جاتا تھا، ناراض ہو جاتا تھا۔ میں نے شروع کے صفحات میں یہ لکھا ہے کہ کلام حیدری کی پوری شخصیت کی تحلیل نفسی کی ضرورت ہے۔ طالب علمی کے دور میں اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے۔ نوکری پورنیہ میں ہوئی، شادی کے بعد اسے بھی چھوڑا اور مستقل طور پر اپنی سسرال شہر گیا میں بس گئے۔ بڑے پیمانے پر تجارت کا آغاز کیا۔ اللہ نے خوب ترقی دی۔ ان کا شمار صوبہ بہار کے ممتاز صنعت کاروں میں ہونے لگا۔ ان کا ادبی ذوق اعلیٰ اور رچا ہوا تھا۔ شہر گیا سے ہفت وار ’’مورچہ‘‘ اور ماہنامہ ’’آہنگ‘‘ کا اجرا کیا۔ پورے صوبہ بہار میں ان کی شخصیت کا ایک خاص رعب تھا۔ سیاست سے بھی گہری دلچسپی تھی۔ امرا، روسا، بیوروکریٹ، نوابین، پروفیسران، ادبا و شعرا کے ساتھ ان کا شب و روز اٹھنا بیٹھنا تھا۔ سبھی ان کے معترف اور قدرداں تھے۔ اس زمانے میں کلام حیدری کی وجہ سے شہر گیا کی علمی حلقوں میں خاص حیثیت تھی۔ ان کی عالیشان کوٹھی تھی۔ کئی نوکر چاکر تھے مگر وہ اپنی ذات میں گُم بالکل تنہا تھے۔ ان کی بیگم شاہدہ حیدری صاحبہ ان

کی حد درجہ عزت کرتیں۔ وہ ان کی مزاج داں تھیں۔ ان کا حد درجہ خیال کرتیں۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی رینا حیدری سے بے پناہ پیار کرتے۔ بعد میں اپنے داماد افیسر احمد اور اپنی نواسیوں کو بھی جان و دل سے زیادہ عزیز رکھتے۔ ان کی خاطر وہ گیا چھوڑ کر دہلی رہنے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ گیا کی محبت اور کاروباری سلسلہ انھیں لوٹنے پر مجبور کر دیتا تھا اور آخر میں وہ شہر گیا میں ہی پیوند خاک بھی ہوئے۔

کلام حیدری تحریر و تقریر دونوں کے مرد میداں تھے۔ آہنگ اور مورچہ میں ان کے لکھے گئے اداریے اور مختلف علمی مجلسوں، مذاکروں، سمیناروں میں ان کی تقاریر اس کا بین ثبوت ہیں۔ البتہ مجلسوں، محفلوں میں ان کی گفتگو، حاضر جوابی دیکھتے ہی بنتی تھی۔ وہ بہت ہی پر لطف گفتگو کرتے تھے اور مخالفین کا جواب بڑے ہی دلچسپ انداز میں دیتے تھے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کلام صاحب مجلسوں، محفلوں میں لطف لے رہے ہوں۔

بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام ۱۹۸۱ء میں پٹنہ میں حسرت موہانی پر ایک اہم سمینار تھا جس میں دہلی سے عنوان چشتی صاحب سمینار میں شرکت کی غرض سے تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں عنوان چشتی صاحب اپنے رعب داب، طنطنے اور اپنی انا کے لیے مشہور تھے۔ علمی اعتبار سے ان کا قد بلند تھا اور ادبی حلقوں میں ان کا خاصا احترام تھا۔ عنوان چشتی صاحب نے جب مقالہ پڑھنا شروع کیا تو وہ حسرت کی بجائے حالی کا ذکر کرنے لگے اور بار بار حسرت کی جگہ حالی کا نام اپنے مقالے میں پڑھتے رہے۔ کلام صاحب نے انھیں ٹوکا، حالی نہیں حسرت، مگر عنوان صاحب نے کوئی توجہ نہیں دی اور انھوں نے پھر حسرت کی بجائے حالی کا ہی نام لیا۔ کلام حیدری صاحب نے محفل میں کھڑے ہو کر کہا کہ ''عنوان صاحب! آپ بار بار حسرت موہانی کی جگہ مولانا حالی کا ذکر کیوں کر رہے ہیں۔'' عنوان چشتی صاحب کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے نہایت ہی کرخت لہجے میں چیختے ہوئے کہا Sit Down آپ بیٹھ جائیے۔ جہاں میں مولانا حالی کا نام لوں سبھی لوگ حسرت موہانی سمجھیں۔ عنوان چشتی صاحب کے اس رویے کا محفل پر برا اثر پڑا۔ سبھی لوگ خاموشی سے بیٹھے رہے، کلام حیدری بھی خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عنوان چشتی صاحب نے جب مقالہ ختم کیا تو اس مقالہ پر گفتگو کے لیے سب سے پہلے کلام حیدری اٹھے اور انھوں نے مائیک سنبھالا۔ ''ابھی آپ نے عنوان چُشتی صاحب سے ان کا مقالہ سنا، کلام حیدری صاحب نے دانستہ طور پر 'چشتی' کو 'چُشتی' کہا۔ سبھی لوگ کلام حیدری کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ایک لمحے کے لیے وہ ٹھہرے

اور فرمایا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں جہاں جہاں میں 'چُشتی' کہوں، وہاں وہاں لوگ چشتی سمجھیں۔'' اب جو محفل لالہ زار ہوئی، قہقہے بلند ہوئے وہ دیکھتے ہی بنتا تھا۔ عنوان چشتی خاموشی سے بس دیکھتے ہی رہے۔ کلام حیدری کی ذہانت و ذکاوت، بذلہ سنجی، خوش کلامی کی ایسی کئی مثالیں موجود ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ انھیں محفلوں میں زیادہ لطف آتا تھا۔

کلام حیدری کسی بھی مجلس و محفل میں تقریر کرنے سے پہلے تقریر کی باقاعدہ کوئی تیاری نہیں کرتے تھے۔ کم از کم پوائنٹ ہی یکجا کرلیں وہ اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ مجلس کے مزاج، حالات اور موضوع کی مناسبت سے وہ برجستہ، عمدہ اور پر لطف تقریر کرتے۔ ان کا مطالعہ وسیع تھا اور ان کی فکر کا دائرہ واضح اور سلجھا ہوا تھا اسی لیے ان کے افکار میں حد درجہ وضاحت و صراحت پائی جاتی ہے۔

کلام حیدری کسی بھی موضوع پر لکھنے پر حد درجہ قدرت رکھتے تھے۔ عام طور پر وہ افسانہ ایک ہی نشست میں لکھتے۔ آہنگ کے اداریے تو ایک ہی نشست میں کسی بھی وقت لکھ ڈالنا ان کا معمول تھا۔ اپنی تحریروں میں زیادہ کانٹ چھانٹ بھی نہیں کرتے تھے، پورے صفحے میں شاید ہی کسی لفظ کو بدلنے کی حاجت ہوتی۔ اس ضمن میں کلام حیدری کی بیگم شاہدہ حیدری صاحبہ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں نے لکھتے لکھاتے ہوئے بھی کبھی انھیں کوئی اہتمام کرتے نہیں دیکھا۔ یعنی کوئی افسانہ لکھ رہے ہوں، یا مضمون، یا اداریہ۔ کچھ بھی لکھتے وقت وہ قلم برداشتہ لکھ ڈالتے تھے۔ کوئی بھی جگہ ہو چاہے آفس کا ٹیبل، جس پر کاروبار کے کاغذات پھیلے ہوئے ہوں، یا گھر کا کوئی کونہ، کوئی کمرہ، جہاں گھر کے لوگ اور بچے موجود ہوں۔ چاہے ڈائننگ ٹیبل ہی کیوں نہ ہو جس پر کھانے کا اہتمام ہو رہا ہو۔ یہ لکھنے پر آتے تو مقررہ وقت کے اندر ہی اپنی من پسند چیز لکھ کر ہی بس کرتے اور میں نے ان کو کبھی اپنی لکھی ہوئی چیز کو دوبارہ صاف کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہاں کاربن رکھ کر لکھتے ضرور تھے تاکہ کاپی رہ سکے۔ حروف صاف اور سجل ہوتے تھے۔ اس لیے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ دوبارہ لکھ کر صاف کیا جائے۔''

(کلام حیدری اپنے گھر میں: شاہدہ حیدری، ماہنامہ سہیل گیا، کلام حیدری نمبر،ص ۳۳)

کلام حیدری کے انتقال کی خبر سن کر ادبی حلقوں میں ماتم چھا گیا تھا۔ان کی صلاحیتوں اور خلوص کا اعتراف اس وقت کے جید عالموں نے کیا تھا۔شمس الرحمٰن فاروقی، جوگندر پال، قمر رئیس، محمد حسن، شبیہ الحسن، عابد رضا بیدار، عبدالقوی دسنوی، رام لعل، شکیل الرحمٰن، عنوان چشتی، منظر شہاب، احمد یوسف، محمد رضوی، وفا ملک پوری، شین اختر، حفیظ بنارسی، عبدالصمد، حسین الحق، علیم اللہ حالی، مشتاق احمد نوری، سید احمد قادری، اویس احمد دوراں، شہزاد منظر، تاراچرن رستوگی، اسلام عشرت، افصح ظفر، مناظر عاشق ہرگانوی، شفق، رضوان احمد، قمر جہاں نے اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی تعزیت کی اور ان کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔محمد حسن نے اپنے مضمون 'پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ' میں لکھا کہ:

'' کلام حیدری بڑے ہی بے دریغ اور بے جھجک آدمی تھے، اختلاف میں سب سے آگے اور ادبی معاملات میں بے لاگ۔اُن کی شخصیت کے جواہر اختلاف ہی میں کھلتے تھے۔مگر اختلاف کی اس اوپری سطح کے نیچے کتنی محبتیں، کتنی قربتیں اور کتنی لگاوٹیں چھپی ہوتی تھیں اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار تھا۔کیسا انوکھا ادب دوست تھا۔یہ شخص جو دور دراز گیا کے علاقے میں بیٹھا ایک چھوڑ دو جرائد نکالتا تھا اور رینا میں ادب دوستوں کی محفلیں سجاتا تھا۔

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا

......میں تو دراصل ان کی شخصیت کی تخلیق پر غور کرتا تھا، کبھی نچلا نہ بیٹھنے والا شخص جو ایک لمحے کے لیے غبی کی طرح نچلا بیٹھنے کو تیار نہ تھا ۔اینٹ کے روڑے کا جواب بھی پتھر سے نہیں فولاد سے دینے میں لذّت لیتا تھا، جس کے لئے زندگی ایک سفر تھی سہانا، ہنستے کھیلتے گذرتی ہے۔ایک دل خوش کن خواب کی طرح۔ایسے لوگ کہاں جو زندگی کو دلفریب سفر کی طرح طے کرتے ہوں اور اس دلفریبی میں دوستوں اور دشمنوں سب کو شامل کرتے ہوں۔نشاط زیست کے ایسے مسافر کہاں

ملتے ہیں۔''

(ماہنامہ سہیل، گیا، ص ۴۸)

کلام حیدری جن ابھرتے ہوئے فنکاروں کو بے حد عزیز رکھتے تھے ان میں ایک نام عبدالصمد کا بھی تھا۔دراصل عبدالصمد صاحب کے والد کلام حیدری کے دوستوں میں تھے، کلام حیدری نے اس کا ہمیشہ لحاظ رکھا اور عبدالصمد صاحب نے بھی اس رشتے کو کلام حیدری صاحب کی آخری سانس تک نبھایا۔کلام حیدری کے انتقال کے بعد انھوں نے کلام حیدری پر ایک بہت ہی عمدہ خاکہ لکھا۔ویسے تو محمد مثنیٰ رضوی کا کلام حیدری پر لکھا گیا خاکہ بے حد مقبول ہوا، مگر عبدالصمد نے اپنے مخصوص انداز میں کلام حیدری کی ظاہری و باطنی خوبیوں اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔عبدالصمد نے کلام حیدری کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ملاحظہ ہو:

'' دیکھنے، ہنسنے، پہننے، اوڑھنے اور رہنے سہنے میں وہ بالکل ماڈرن تھے۔ایک دم اکیسویں صدی میں جانے کے لیے تیار۔لیکن اندر سے وہ بہت پرانے آدمی تھے، پرانی تہذیب کے دلدادہ، پرانے کھانوں کے شوقین اور پرانے زمانے کو یاد کرنے والے۔ایک دن ، دو دن، ہفتہ دو ہفتہ کی بات بڑی آسانی سے بھلا دیتے۔لیکن آپ ان سے ان کے گاؤں میں پھلنے والی سبزیوں کے رنگ پوچھ لیجیے جنھیں دیکھے ہوئے چالیس پچاس سال گذر چکے ہیں۔آپ ان سے گاؤں کے ایک ایک آدمی کی تعریف سن لیجیے۔شہر سے گاؤں تک پہنچنے میں جو دھول انہوں نے کھائی، اس کا مزہ انہیں ہمیشہ یاد رہا۔آپ نے اگر ان کے ساتھ کبھی سفر کیا ہو، آپ کو امید ہی نہیں، یقین کامل ہو کہ اگر چائے پان کی ضرورت ہوئی تو کم از کم ایک ہی اسٹار کے درشن ہو جائیں۔کلام حیدری تاجر اور ان کی فیئٹ کو دیکھ کر یہ یقین کرنا کوئی ایسا گناہ بھی نہیں ہوتا۔۔لیکن ہوا یہ کہ راستے میں ایک ڈھابہ نظر آ گیا اور گاڑی وہیں کھڑی ہو گئی۔اندر بیٹھنے تک کی جگہ نہیں۔یوں ہی ایک

بے ڈھب سا اسٹول رکھا ہے۔ آپ سوچتے ہی رہ گئے اور یہ اسٹول پر
بڑے اطمینان سے بیٹھ کر پکوڑے اور چائے کی فرمائش بھی کر بیٹھتے۔
آپ نے ناک بھوں چڑھائی اور ان کا لیکچر شروع۔
''ارے کھاؤ میاں۔۔۔۔۔تکلف نے تم لوگوں کو برباد کر کے
رکھ دیا ہے۔''

دوسری طرف شہر اور صوبے سے باہر آپ فائیو اسٹار ہوٹلوں سے نیچے درجے کے ہوٹلوں میں ٹھہرنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ لیکن توبہ کیجیے فائیو اسٹار ہوٹلوں کو بھی انھوں نے ڈھابہ بنا رکھا تھا۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھنا اور لوٹیں لگانا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی انہیں اچھا لگتا تھا۔''

(ماہنامہ سہیل گیا، کلام حیدری نمبر، ص ۱۰۷-۱۰۸)

کلام حیدری دوستوں کے دوست تھے۔ غیاث احمد گدی سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔ شہر گیا کی ایک فعال ادبی انجمن کے زیر اہتمام غیاث احمد گدی کے انتقال کے بعد کلب میں ایک بڑے تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں شہر گیا کے بیشتر ادبا و شعرا موجود تھے۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے کلام حیدری نے خصوصی طور پر جھریا سے الیاس احمد گدی، اور پٹنہ سے احمد یوسف کو بلوایا۔ اس محفل میں کلام حیدری نے غیاث احمد گدی کی شخصیت اور فن پر جس جذباتی انداز میں گفتگو کی، اسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ پورے جلسے میں کلام حیدری چھائے رہے۔ دراصل یہ جلسہ بھی ان ہی کی مخصوص معاونت کی وجہ سے اس قدر شاندار طریقے سے منعقد ہو پایا۔ چند نوجوان طالب علموں کی کوششوں کی انھوں نے خوب خوب تعریفیں بھی کیں اور غیاث احمد گدی کو اپنے عہد کا منفرد فنکار قرار دیا۔

کلام حیدری کی پوری زندگی طویل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اپنے زمانے میں انھوں نے شہر گیا کو اپنی ادبی و علمی سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ہندوستان کا ایک اہم مرکز بنا ڈالا۔ گیا کی شناخت مہاتما بدھ اور وشنو پد مندروں، رام وساگر اور بیتھو شریف کی خانقاہوں سے قائم رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کلام حیدری کی ذات و صفات ان کے رسائل آہنگ اخبار مورچہ، دی کلچرل اکیڈمی گیا کی علمی و ادبی سرگرمیاں، کلام حیدری کا دولت کدہ رینا ہاؤس نے گیا کی شناخت کو مزید مستحکم بنا دیا۔ ان کی زندگی میں

رینا ہاؤس میں ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ محفل آرائی ان کا خاص ذوق وشوق تھا۔ وہ ہندوستان کے بڑے سے بڑے ادیب سے دبنے والے نہیں تھے۔ سبھوں کی قدر کرتے مگر جب کوئی ان سے دو ہاتھ کرنے کو تیار ہوتا تو وہ اپنا پنجہ فوری طور پر آگے کر دیتے۔ انھوں نے معاشی اعتبار سے کمزور ادیبوں کی خاموشی سے بھر پور مدد کی۔ سماجی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ان کی ذات سے پورے شہر گیا میں رونق رہتی تھی۔ ان کے دوستوں کے علاوہ مخالفین اور حاسدین کی بھی بڑی تعداد تھی۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتے۔ اپنی دُھن میں اپنے راستے پر چلتے رہتے تھے۔

بلاشبہ کلام حیدری ایک معروف افسانہ نگار، بڑے ادبی صحافی اور صنعت کار تھے لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ وہ بے پناہ خوبیوں کے مالک انسان اور بڑے فنکار بھی تھے۔ جس کا اعتراف لازمی ہے۔ ان کی زندگی کے نشیب وفراز نے انھیں بہت کچھ سکھایا۔ انقلاب، احتجاج، جیل، ہوٹل، سنیما کی منیجری، لکچر شپ، صنعت کار یہ سب اُن کی زندگی کا حصہ رہے۔ ان کی والدہ نہایت نیک، خداترس اور اصولوں کی سخت خاتون تھیں جنھوں نے کلام حیدری کو سنوارنے اور نکھارنے میں سب سے اہم رول ادا کیا۔ وہ اپنی بڑی بہن 'آپا' سے ازحد پیار کرتے تھے۔ تقسیم وطن کے بعد وہ ان سے بچھڑ گئیں۔ اس کا شدید احساس انھیں زندگی بھر رہا جس کا ذکر انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں شدت سے کیا ہے۔

کلام حیدری بنیادی طور پر تخلیقی فن کار تھے۔ ادب ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھا جس کی پناہ میں انھوں نے پوری زندگی بسر کی۔

کلام حیدری کی افسانہ نگاری

اردو افسانے کی دنیا میں کلام حیدری کی شناخت ایک اہم اور معتبر افسانہ نگار کی ہے۔ان کے افسانوں کے چار مجموعے 'بے نام گلیاں' (۱۹۵۵ء)، صفر (۱۹۷۴ء)، الف لام میم (۱۹۷۹ء) اور گولڈن جوبلی (۱۹۸۳ء) شائع ہوئے۔اِن مجموعوں میں کل اٹھاون (۵۸) افسانے شامل ہیں۔ان کے علاوہ اُن کے متعدد افسانے ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے لیکن انھوں نے اپنے افسانوی مجموعوں کی اشاعت میں انتخاب کی کسوٹی پر پرکھ کر صرف ان افسانوں کو شامل کیا جنھیں انھوں نے یقیناً بہتر تسلیم کیا ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ انھوں نے اپنے چاروں افسانوی مجموعوں میں ناقدین ادب کا کوئی 'پیش لفظ' شامل نہیں کیا ہے۔ دراصل اُن کا یہی انداز اور رویہ انھیں متعدد دوسرے تخلیقی فنکاروں سے مختلف ومنفرد بناتا ہے۔کلام حیدری میں غضب کا اعتماد تھا۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ جب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تو اُس وقت ان کی عمر محض پچیس برس تھی۔ظاہر ہے کہ اس مجموعے میں بھی کسی نقاد کا کوئی 'پیش لفظ' شامل نہیں کرنا اُن کے بھرپور اعتماد کو عیاں کرتا ہے۔اس کی وجہ وہ خود بتاتے ہیں:

> ''پیش لفظ والی رسم ادا کی جاسکتی تھی اور اس اشتہاری زمانہ میں میرے لیے کسی قدر فائدہ مند بھی ہوتا مگر میں اپنے لیے ریت کے محل بنانے کو پسند نہیں کرتا۔اگر ان کہانیوں میں سچ مچ کوئی حُسن ہوگا تو یوں بھی اپنا خراج وصول کرلیں گی۔اس کا مجھے یقین ہے۔''

کلام حیدری کی یہ حد درجہ خوداعتمادی تھی اور فن کے ساتھ گہرا کمٹ منٹ تھا۔وہ بیساکھیوں کے سہارے اپنا قد بلند کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمیشہ انھوں نے اسی اصول کو اپنایا بھی۔شاید اسی لیے انھوں نے کسی ادبی تحریک یا رجحان کی پیروی نہیں کی بلکہ اپنی راہ خود بناتے چلے گئے۔انھوں نے اپنے ادبی سفر کا

آغاز ترقی پسند تحریک سے شدید طور پر متاثر ہوکر کیا اور اس کے ہم نوا رہے مگر اپنے افسانوں میں وہ نت نئے تجربات کرتے رہے۔ان کے پہلے افسانوی مجموعے 'بے نام گلیاں' پر ترقی پسند تحریک کے واضح اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کے بعد کے ان کے تینوں افسانوی مجموعوں میں وہ جدیدیت کے رجحان سے متاثر نظر آتے ہیں۔

کلام حیدری کا پہلا افسانہ 'بھابھی' کلکتہ کے رسالے 'جدید اردو' میں ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے بعد وہ تسلسل کے ساتھ افسانہ لکھتے رہے۔۱۹۵۵ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا۔اس دس برس میں ان کے متعدد افسانے شائع ہوئے اور کئی افسانے غیر مطبوعہ ہی رہے۔ اِس مجموعے کی اشاعت کے ضمن میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک کے سارے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ افسانوں کو بھول چکا ہوں، بھلا دیا ہے یا تلف کردیا ہے۔۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک کے تیس بتیس افسانوں میں سے چند کو ایک جگہ جمع کر کے 'بے نام گلیاں' کے نام سے شائع کردیا۔محض اِس خیال سے کہ ریکارڈ رہے اور اگر شاید افسانہ نگار بن گیا تو لوگوں کے کام آئے۔''
>
> (آہنگ، گیا شمارہ ۱۱۴، ص ۱۴)

'بے نام گلیاں' میں کل چودہ افسانے کھلیان اور سلاخیں، راہی نے پتھ پہچانا، قیامت، روپ بہروپ، دعا، بے نام گلیاں، مثلث، ماہتاب مستقبل اور ایٹم بم، مسکراہٹ کے پیچھے، میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، بھول، غم، محبت بھی ایک حقیقت، دو آنکھیں ایک کھڑکی کے علاوہ مجرم شامل ہیں۔ان افسانوں میں ترقی پسند فکر ونظریات کے عناصر واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۵ء کا زمانہ ویسے بھی ہندوستان میں سیاسی وسماجی انتشار، شدید کرب اور تغیر وتبدل کا زمانہ رہا ہے۔غربت، افلاس، ذات پات کے مسائل کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستی اور تقسیم ہند کے زخم سے تمام ہندوستانی بلبلا رہے تھے۔انسانی محبت، انسان دوستی، ہمدردی، امن و شانتی کا پیغام دینے والے فنکاروں نے ہمت نہیں ہاری اور اِس سلگتے معاشرے، منقسم طبقات، غربت وافلاس سے نبرد آزما مزدور اور کسان، پریشان حال متوسط اور لاچار پست

طبقات کے مسائل کچھ ایسے تھے جس نے ان فنکاروں کو بہت کچھ سوچنے اور لکھنے پر مجبور کردیا۔ان ہی فنکاروں میں ایک فن کار کلام حیدری بھی تھے۔جن کا تخلیقی رویہ، حقیقت پسندی اور بیانیہ اسلوب نے اس عہد کے ادیبوں کو چونکنے پر مجبور کردیا۔

افسانہ ’کھلیان اور سلاخیں‘ میں کلام حیدری نے اُس عہد میں بہار کے دیہی مسائل کو اپنے حقیقت پسندانہ اسلوب میں موثر طور پر پیش کیا ہے۔سرجو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے، جو گاؤں کے تمام تر انسانی رشتوں سے بندھا ہوا ہے۔گاؤں میں قحط پڑتا ہے، وہ بیل بیچ کر کانوں میں مزدوری کرنے چلا جاتا ہے۔وہاں اسے نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔بھوکے مزدور نوکری کی تلاش میں ہیں۔مزدوروں کا ہجوم ہے مگر نوکری نہیں ہے، ایسے وقت میں مزدوری گھٹا دی جاتی ہے تو مزدور زبردست احتجاج کرتے ہیں، ہڑتال پر چلے جاتے ہیں۔ایسے وقت میں پولیس مزدوروں پر لاٹھی چارج کرتی ہے، کئی مزدور گرفتار ہوجاتے ہیں، ان مزدوروں میں سرجو بھی تھا، عجیب المیہ تھا۔بھوک، بے روزگاری، قحط اور جیل کی سلاخیں۔کلام حیدری نے اس پورے افسانے کو نہایت عمدگی سے بُنا ہے جس میں مقام بولی ٹھولی، مکالمے، سماج اور کرداروں نے اِس افسانے کو اس طبقے کے مسائل کا جیتا جاگتا نمونہ بنا دیا ہے۔کلام حیدری گاؤں کی فضا، وہاں کی زبان، اُن کے مسائل سے بخوبی واقف تھے۔وہ انسانی دکھ سکھ اور رشتوں کو تخلیقی حسن کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ویسے بھی اس عہد میں پریم چند کے اثرات کافی تھے۔بہار میں سہیل عظیم آبادی کے تخلیقی جوہر کا سکہ قائم تھا۔ان دونوں کے افسانوں میں گاؤں، کسان، غربت، مزدور اور اِس معاشرے کے مختلف مسائل کو نت نئے زاویوں سے پیش کیا جا رہا تھا۔کلام حیدری کے اِس افسانے میں بھی ان کی ذہانت اور خلاقی کی چنگاریاں روشن نظر آتی ہیں۔سرجو کا کردار ایک جاندار کردار ہے جسے کلام حیدری نے بڑی محنت سے بُنا ہے۔افسانے کی زبان اور پیرایۂ بیان شگفتہ اور عمدہ ہے۔اس افسانے کو پڑھ کر اس عہد کی معروف ترقی پسند مصنفہ رضیہ سجاد ظہیر نے سہیل عظیم آبادی کو ایک خط لکھا تھا:

> ’’کلام حیدری کا افسانہ دیکھ رہی تھی اور ختم کرنے کے بعد میرا بے اختیار جی چاہا کہ کلام کو مبارکباد دوں۔بڑا زوردار افسانہ ہے۔میں نے کلام کا نام بھی نہیں سنا تھا اور یہ افسانہ دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی

> ہوئی کہ ہمارے یہاں کیسا Talent ہے۔کتنے جواہرات ہیں، جن کی چمک دمک ہم نے ابھی دیکھی ہی نہیں، کلام کو میری طرف سے بہت بہت پیار کہنا۔بہت دعا کہنا..... ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات...... بھئی کیا کہوں، میرا دل تو چاہتا ہے کہ اس افسانہ کی تعریف کیے ہی جاؤں۔حالات کی کتنی اچھی عکاسی، کیسی پیاری زبان، عوام کا کتنا گہرا درد اور ان کی کیسی صحیح Under standing...... ہماری تحریک اور ہمارے ادب کو ایسے لکھنے والوں کی بڑی ضرورت ہے۔‘‘

(کلام حیدری بحیثیت افسانہ نگار: ڈاکٹر اسلام عشرت، انڈین لینگویجز پبلی کیشنز، گیا، ص:۱۹)

رضیہ سجاد ظہیر کے یہ تاثرات جذبات سے پُر اور دلکش ہیں۔جس سے یقیناً کلام حیدری کو بھی حوصلہ ملا ہوگا اور ان کے اندر کے اعتماد کو مزید تقویت حاصل ہوئی ہوگی۔اُس عہد میں نئے اور نوجوان لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا عام وتیرہ تھا جس کے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوتے تھے۔مگر رضیہ سجاد ظہیر نے اپنے اس خط میں کلام حیدری کے اِس افسانے کی زبان، عوام کے دکھ درد سے ان کے گہرے رشتے، معاشرے کے موثر عکاسی وغیرہ کی جو تعریف کی ہے، وہ قابل غور ہے۔ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جب یہ افسانوی مجموعہ شائع ہوا اس وقت کلام حیدری کی عمر محض پچیس برس تھی۔یہ افسانہ پہلی بار رسالہ ’تہذیب‘ پٹنہ میں شائع ہوا تھا جسے پڑھ کر رضیہ سجاد ظہیر متاثر ہوئی تھیں۔

کلام حیدری کے اس مجموعے میں ’بے نام گلیاں‘ کے عنوان سے ایک افسانہ بھی شامل ہے۔اس افسانے کے نام پر ہی کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔کلام حیدری کے بقیہ تین افسانوی مجموعوں کے نام ان مجموعوں میں شامل اسی نام کے افسانوں پر رکھا گیا ہے۔الف لام میم، صفر اور گولڈن جوبلی بھی کلام حیدری کے افسانے ہیں اور یہی نام ان مجموعوں کے بھی ہیں۔بہرکیف کلام حیدری نے افسانہ ’بے نام گلیاں‘ میں عظیم آباد (پٹنہ) کی گلیوں اور ان کے مکینوں کی زبوں حال زندگی کو پیش کیا ہے۔اُن نیم تاریک گلیوں میں بیماریاں، وبائیں، مختلف مسائل اور غربت کا ڈیرا ہے۔جہاں نالیوں کی گندگی، بساند، مچھروں، کیڑوں کا بسیرا ہے۔کلام حیدری نے اس افسانے میں فلسفیانہ انداز میں معاشرے پر گہرا طنز کیا ہے۔انھیں یہ امید

ہے کہ ایک نئی روشن صبح ہوگی، یہاں کے مکینوں کو بھی وقار اور سماجی برابری کا مرتبہ دیا جائے گا۔ یہاں بھی ترقی ہوگی۔ جمہوری نظام کی برکتیں انھیں بھی نصیب ہوں گی مگر کب ـــ؟ وہ خود سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ مختصر یہ کہ کلام حیدری نے اپنے حقیقت نگار قلم سے ایک ایسے معاشرے کی تصویر کشی کی ہے جہاں تاریکی، اندھیرا، بساند، چولہا، ٹاٹ، چیتھڑے اور مچھر و کیڑے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی رمق نہیں۔ برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہاں اوجھڑی شاہ کا مزار بھی ہے جہاں لوگ منتیں مانگتے ہیں مگر ان کے مقدر میں افلاس لاچاری اور بے چارگی ہے۔ اس افسانے کے ذریعے کلام حیدری حاکم طبقے کو جھنجھوڑتے بھی ہیں کہ ان کی قسمت کب بدلے گی۔ انھیں بھی نئی صبح کا انتظار ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ء کو ہندوستان میں جمہوری نظام کی داغ بیل پڑی اور اس روشن صبح جب سارے ہندوستانی جشن منا رہے تھے۔ کلام حیدری جیل کی سلاخوں کے پیچھے تھے۔ حکومت مخالف رویوں کے خلاف جلوس میں شامل ہونے اور پٹنہ یونیورسٹی کے بند صدر دروازہ کا تالا توڑنے کی پاداش میں انھیں جیل کی کوٹھری نصیب ہوئی تھی۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک انھوں نے پٹنہ کی گلیوں میں جن مسائل وصعوبتوں کو دیکھا ایک حساس فنکار کے دل ودماغ پر وہ تصویریں اور پریشانیاں چھا گئیں، جنھیں کلام حیدری نے افسانہ 'بے نام گلیاں' کے نام سے اپنے بیانیہ اور دلکش اسلوب میں موثر انداز سے پیش کیا ہے۔

افسانہ 'قیامت' میں کلام حیدری نے معاشی طور پر کمزور لڑکیوں کی شادی کے مسائل اور اس کے بھیانک نتائج کو تمام جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آزادی اور تقسیم ہند کے بعد بیشتر آسودہ حال مسلم خاندان کے افراد پاکستان ہجرت کر گئے۔ چند تعلیم یافتہ اور معاشی طور پر مضبوط خاندان نے ہندوستان میں قیام کو ہی ترجیح دی، متعدد خاندان نے اِسی سرزمین اور خاک پر جینے اور مرنے کی قسم کھائی۔ نچلا متوسط طبقہ مختلف مسائل سے دوچار روایات کی جکڑ بندی میں سفید پوشی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا، جبکہ اعلیٰ دولت مند خاندان نے دولت کو سب سے زیادہ اہمیت دی تھی۔ اسی معاشرے میں ایک غریب خاندان کی دوشیزہ کو ایک سفید داڑھی والے مولوی کے نکاح میں دے دیا جاتا ہے۔ ایک کنواری لڑکی ماں باپ کے سینے پر بوجھ تھی وہ کسی بھی حالت میں اُس کی شادی کرنا چاہتے تھے، مگر معاشرے میں کوئی دوسرا رشتہ نہیں ملتا ہے۔

اس مولوی صاحب کے سرد آغوش میں دوشیزہ کا زندگی بسر کرنا کسی قیامت سے کم نہیں۔ کلام حیدری نے مسلم معاشرے کے مسائل پر گہرا طنز کیا ہے۔ مخصوص استعاراتی انداز بیان میں تحریر کردہ کلام حیدری کی یہ اچھی کہانی ہے۔ کہانی کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر اللہ کے دربار میں اب بھی دیر تھی، اندھیر تو خیر ہو ہی نہیں سکتا۔ گھر میں پھر وہی اُلجھی سلجھی خاموشیوں کے پرندے نے اپنے پر پھیلا دیئے۔ پُر اسرار سائے لمبے اور گہرے ہوگئے، خاموشیوں کی پرچھائیوں کے اندر، جیسے گویائی بیٹھی تھی۔ پیسہ پیسہ ـــ کھُسر پھُسر ـــ سرگوشیاں ـــ اور ایک بار پھر خاندان پر قیامت ٹوٹ پڑی ـــ آفتاب سوا نیزے پر آ گیا۔ زمین اور پہاڑ روئی کے گالوں کی مانند ہوا میں اڑنے لگے اور پھر آشا کے پالنے کی ریشمیں ڈوریوں کو نراشا کی قینچی نے کاٹ دیا اور خاندان دھم سے زمین پر آ گرا۔

(کہانی قیامت، بے نام گلیاں، ص ۶۳)

اس افسانے کی پیکر تراشی اور استعاراتی نثر اس کا حسن ہے۔ کلام حیدری کے افسانوں میں آہستہ آہستہ نکھار ہوتا گیا جسے ان کے بعد کے افسانوی مجموعوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کہانی 'روپ بہروپ' میں بھی مسلم معاشرے کے ایک ایسے ہی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے۔ جس میں ایک مولوی صاحب اپنی غربت وافلاس اور ناقدری کی وجہ سے دوہری زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ ان کا ضمیر مردہ ہوجاتا ہے۔ ان کی ایک لڑکی فیضو کوچوان کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ وہ دوسری جوان لڑکی کے لیے ایک نو وارد پروفیسر کو مختلف طرح سے اپنے جال میں پھنسانا چاہتے ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ لڑکی پرزہ بھیج کر اپنے چھوٹے بھائی کے توسط سے پروفیسر سے روپے منگواتی رہتی ہے اور خاموشی سے اس سے تنہائی میں مل کر اس کا قرض اتارتی رہتی ہے۔ مولوی صاحب ان تمام حالات سے واقف ہیں لیکن وہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ اقتصادی بدحالی اور مردہ ضمیر نے انھیں سماج میں دوہری زندگی بسر کرنے اور مکھوٹا لگا کر رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دراصل کلام حیدری مسلم معاشرے کی سفاک حقیقتوں کو اپنے

افسانوں میں طشت از بام کرتے ہیں اور سماج کے تمام سفید پوشوں کو جھنجھوڑتے ہیں کہ یہ سماج ان کا بنایا ہوا ہے۔ سماجی رویوں میں تبدیلی لانا ضروری ہے اور بہتر سماج بنانے کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔

کلام حیدری نے اپنے افسانے 'دعا' میں مسلم معاشرے میں مسلکی اختلاف، ذات پات، شیعہ سنی کی تفریق کو بڑی بیبا کی اور جرأت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن سے ہمارا معاشرہ بری طرح متاثر رہا ہے اور آپسی اتحاد و اخوت کی جگہ نفرت کا بازار گرم رہتا ہے۔ کلام حیدری نے ایک غیر مسلم کردار چندر بابو کو پیش کیا ہے جو اعلیٰ اخلاق، مروّت و محبت، شرافت و نیکی کا نمونہ ہیں جو انسان دوستی کو مقدم تسلیم کرتے ہیں جبکہ مسلم کرداروں کا عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلم معاشرے میں یہ کمی کیوں کر ہے۔ آپسی اختلافات جو دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو چاٹ رہے ہیں ان کا خاتمہ کب اور کس طرح ہوگا؟ ہم اخلاقی طور پر اتنے پست کیوں ہیں؟ یہ وہ سوال ہیں جو اس افسانے میں قائم ہوتے ہیں۔ کلام حیدری انسان دوستی کو سب سے مقدم سمجھتے ہیں اور آپسی نفاق کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔

افسانہ 'بھول' میں بھی متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں کے اُس خانگی مسئلے کو پیش کیا گیا ہے، جہاں اگر کوئی عورت ماں نہیں بنتی ہے تو اسے بانجھ تصور کر کے مرد دوسری شادی کرنا چاہتا ہے جس سے عموماً بنی بنائی ازدواجی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ شوہر شمس کو شدید احساس ہے کہ شادی کے تین سال بعد بھی اس کی بیگم سلطانہ کی گود نہیں بھری۔ شمس کے دوست مسلسل بحث کرتے ہیں، شمس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ عورت ہی بانجھ ہو۔ وہ اسے سلطانہ کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کا مشورہ بھی دیتے ہیں مگر روایت کی پاسداری، خاندانی وقار اور جہالت کی وجہ سے شمس تیار نہیں ہوتا۔ دوست جب شمس کو خود ڈاکٹر سے مشورہ کرنے اور دکھانے کی بات کرتے ہیں تو شمس بڑی حقارت سے اُنھیں دیکھتا ہے کہ کیا کہیں مرد میں بھی یہ کمی ہو سکتی ہے۔ آخر میں نہایت ہی ڈرامائی انداز میں یہ عقدہ کھلتا ہے کہ مرد ہی کسی کمی کا شکار ہے عورت میں کوئی کمی نہیں ہے۔ شادی سے قبل عورت سے ایک بھول ہوئی تھی اور وہ ماں بن چکی تھی۔ شمس پریشان ہو جاتا ہے۔ دراصل اس کہانی میں بھی کلام حیدری نے مسلم طبقے کی اس کمی کو طشت از بام کیا ہے جس میں یہ طبقہ گرفتار ہے۔ عورت کو مورد الزام ٹھہرانا، سائنسی دور میں ڈاکٹروں سے صلاح و مشورہ نہ کرنا، صداقت و حقیقت کو جانے بغیر دوسری شادی کرنا، عورت کو بانجھ کہہ کر اسے اذیت پہنچانا، خاندانی عظمت و

وقار کے نام پر بسے بسائے گھر کو اجاڑ دینا، اپنی خامیوں پر نگاہ نہ کر کے دوسروں کو قصوروار ٹھہرانا، یہ وہ مسائل ہیں جو کلام حیدری کو پریشان کرتے ہیں اور اپنے ان تفکرات کو انھوں نے نہایت عمدگی کے ساتھ مکالماتی پیرائے میں اس افسانے میں پیش کیا ہے۔

'بے نام گلیاں' کلام حیدری کے افسانوی سفر کی خشت اوّل تھی۔ جس میں ترقی پسند تحریک کے سماجی و اصلاحی پہلو غالب تھے۔ وہ ایک بہتر معاشرے کا خواب دیکھتے ہیں۔ روشن خیالی، عقلیت پسندی، انسان دوستی کا پیغام دیتے ہیں۔ کلام حیدری کے اِس مجموعے کی زبان تخلیقی، استعاراتی اور شگفتہ ہے۔ کردار نگاری پر وہ قدرت رکھتے ہیں اور ان کا پیرایہ بیان بھی دلکش ہے۔ وہ اپنے بیانیہ اسلوب اور حقیقت نگار قلم کو ترجیح دیتے ہیں۔ جذبات نگاری اور پیکر تراشی میں بھی اُن کے قلم کی جادوگری قائم ہے مگر یہ ان کی اولین کوشش تھی۔ یہ ان کے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء کے درمیان تحریر کردہ افسانے ہیں۔

کلام حیدری کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'صفر' ستمبر ۱۹۷۴ء میں پہلے مجموعے 'بے نام گلیاں' (فروری ۱۹۵۵ء) کے لگ بھگ ساڑھے انیس برس بعد منظر عام پر آیا۔ اس دوران کلام حیدری کی زندگی میں کئی انقلاب آچکے تھے اور وہ زندگی کے نشیب و فراز میں ادب کی کشتی کے کھیون ہار بن چکے تھے۔ ادبی، سماجی، سیاسی، کاروباری سطح پر اب ان کی ایک خاص شناخت قائم ہو چکی تھی۔ ماہنامہ 'آہنگ' اور 'مورچہ' کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور کلام حیدری ماہنامہ 'آہنگ' کے پلیٹ فارم سے اچھا خاصا ادبی محاذ قائم کر چکے تھے، مخالفین کے دانت کھٹے بھی کر رہے تھے اور وار سہہ بھی رہے تھے۔ نئے فنکاروں کو 'آہنگ' میں متعارف کر رہے تھے اور پرانے فنکاروں کی قدردانی کر رہے تھے۔ وہ شہرت کی بلندیوں پر تھے۔ کلام حیدری کے افسانے تواتر کے ساتھ رسائل میں شائع تو ہو رہے تھے مگر افسانوں کا مجموعہ ایک طویل وقفے کے بعد منظر عام پر آیا جس کا اسلوب، طرز اور فکری رویہ مختلف ہے۔

'صفر' میں سولہ افسانے شامل ہیں جن کے نام عنابی کانچ کا ٹکڑا، سخی، زندانی، درد، واپسی، ادھار، حادثہ، بابو، روشنی، بھیک، لا، اسیر، تلاش، اپنی آوازیں، کس کی کہانی، اور صفر ہیں۔ فنی اعتبار سے پہلے مجموعے کے بعد ان افسانوں میں ایک واضح تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلام حیدری ترقی پسندی کے حصار اور دائرے سے باہر نکل کر اپنی ایک نئی راہ تلاش کرتے ہیں۔ کلام حیدری ایک ذہین

اورخلاق فنکار تھے۔انھیں فنکار کی مکمل آزادی پسند تھی۔انھوں نے افسانہ نگاری کے لیے نیا راستہ اختیار کیا جسے بعض ناقدین نے جدیدیت سے عبارت کیا ہے۔ میری رائے بالکل مختلف ہے۔ کلام حیدری کی ذہانت وذکاوت، جودت ذہنی، آزادخیالی، بیباکانہ رویہ قطعاًاس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ کسی حصار میں قید ہوکر رہیں۔ان کے مزاج میں بلا کی تیزی وتندی اورغضب کی آزادہ روی تھی۔ وہ کسی نظریات و رجحانات سے متاثر تو ہوسکتے تھے مگر اس کے غلام نہیں ہوسکتے تھے۔اپنے افکاروخیال کوطاق پر رکھ کر کسی بنی بنائی لکیر پر چلنے کے وہ ہرگز قائل نہیں تھے۔ بلاشبہ کلام حیدری کوترقی پسند افکار پسند تھے۔وہ اس تحریک سے برسوں وابستہ بھی رہے مگر وہ ادیب کی آزادی کے قائل تھے۔اس لیے ’صفر‘ کے چند افسانوں پر جدیدیت کی لہر کے اثرات کی جو بات کی جاتی ہے وہ غلط بھی نہیں ہے مگر اس مجموعے میں مختلف انداز کے افسانے ملتے ہیں۔فنی وتکنیکی اعتبار سے بھی یہ افسانے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔اس مجموعے کے مطالعے سے یہ خیال ہوتا ہے کہ ایک ماہر افسانہ نگار، فلسفی اور ناسٹیلجک کلام حیدری ہمارے سامنے ہیں۔

اِس مجموعے میں شامل ’عنابی کانچ کاٹکڑا‘ پہلا افسانہ ہے جسے افسانہ نگار نے بڑی فنی چابکدستی اور پختگی کے ساتھ پروان چڑھایا ہے۔خودکلامی کی تکنیک میں لکھے گئے اس افسانے میں مرکزی کردار سوشیل کی لاشعوری اورتحت الشعوری کیفیت اوراس کی ماں کے تجسس ومکالمے کوافسانہ نگار نے بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔افسانے کا کوئی ایک طے شدہ موضوع نہیں ہے، مگر مرکز میں فساد اور مذہبی منافرت کے زہر میں ڈوبا معاشرہ ہے۔عنابی کانچ کاٹکڑا ایک علامت ہے۔اس سے انگلیاں کٹ سکتی ہیں۔اس میں ہرطرف دھار ہے، یہ نوکیلا ہے جوانگلیوں میں چبھ سکتا ہے۔

دراصل سوشیل کے گھر کے سامنے والے محلے کے چھوٹے سے ایک مکان میں کوئی مسلمان خاندان رہتا تھا۔جس پر ایک ہزار کے مجمع نے حملہ کردیا۔گھنٹوں ہنگامہ برپا ہوتا رہا۔مکان بالکل اجڑ گیا۔ پولیس آئی تو محلّہ پر قبرستان کی خاموشی تھی۔دالان میں ایک بوڑھی عورت اور پندرہ سالہ نوجوان لڑکے کی لاش پڑی تھی۔اس مکان کی اٹھارہ سال کی ایک لڑکی کا اغوا ہو چکا تھا۔اس کا باپ جوکلکتہ میں پھلوں کی دکان کرتا ہے، محلّہ میں آیا تو پاگلوں کی طرح گھوم رہا تھا۔افسانہ نگار نے اس لڑکی کے خوابوں کوافسانوی رنگ میں ڈھالا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

’’اس کی اٹھارہ سال کی لڑکی نہ زندہ تھی، نہ مردہ۔وہ کہاں گئی؟ وہ کہیں تو ہے اور اس لڑکی کا گھر سونا پڑا ہے۔اس نے برسوں خواب میں، جاگتے ہوئے اس مکان میں شہنائیوں کی آوازیں سنی ہوں گی، ڈھولک پر رس بھرے گیتوں کی موسیقی، اس کے کانوں میں گونجتی رہی ہوگی۔خوابوں میں اس نے اپنے ہیروکو دیکھا ہوگا۔اپنا ڈولا اٹھتے ہوئے دیکھا ہوگا اور آنگن میں لگے ہوئے مہندی کے پیڑ سے اس نے طے کیا ہوگا کہ رنگ شوخ آنا چاہیے۔اس آنگن میں منہدی کا پیڑ اس دلہن کوڈھونڈتا ہوگا جس کے پوروں کو رنگ دینے کے انتظار میں اس نے اپنی نازک شاخیں پھیلا رکھی تھیں۔شہنائیوں کی گونج سے بھرے کانوں نے کتنی غیر مہذب باتیں سنی ہوں گی۔‘‘

(عنابی کانچ کاٹکڑا)

فسادات اکثر کسی دوسری جگہ کے ردِّعمل یا مذہبی وسیاسی رہنماؤں کے اکسانے اور ورغلانے پر ہی ہوتے ہیں اور نتیجے میں معصوموں کی جانیں جاتی ہیں۔ خاندان، مکان سب تباہ ہوجاتے ہیں۔ انسانیت شرمسار ہوتی ہے اور حیوان قہقہے لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ آزادی سے قبل سے اب تک چل رہا ہے۔ممکن ہے کلام حیدری نے کلکتہ کے فساد جس میں سینکڑوں لوگ مارے گئے تھے گھر مکان تباہ وبرباد ہوگئے تھے اسی سے متاثر ہوکر لکھا ہے۔مگر اس مکان کی کھڑکی کا شیشہ سوشیل حفاظت سے رکھ لیتا ہے، جو عنابی رنگ کا ہے کہ جہاں کے شیشے کے پیچھے سے دوآنکھیں اکثر نظر آتی تھیں اور سوشیل اسے دیکھا کرتا تھا مگر ان آنکھوں کو اغوا کرلیا گیا تھا۔

مرکز میں فساد کا موضوع ضرور ہے مگر اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ وتہذیب بالخصوص ہندو مسلم تنازعہ کوفلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔بعض علاقوں میں مسلم تاجروں کی حکمرانی، اپنے ہندو ملازمین پر ظلم کرنا، صاحب ثروت اوراعلیٰ عہدوں پر فائز مسلم افسران کے بچوں کی بے راہ روی، اردو ہندی زبان کا مسئلہ، مسلمان بادشاہوں کی تعمیر شدہ عمارتوں پر زبردستی ہندو حکمرانوں کا نام تھوپنا، ہندوستان کے

لیے ہندو اور مسلمان دونوں کا لازم و ملزوم ہونا، سیاست و اقتدار میں متعصب اشخاص کا حد درجہ دخل بڑھ جانا، عام عوام کی فکر و سوچ کو تبدیل کر کے ہندوستان کو ہندو راشٹر بنانے کی کوششیں کرنا، ضمیر فروش انسانوں کا اعلیٰ اقتدار پر فائز ہونا، افسران اور سیاسی رہنماؤں کی پارٹیوں میں شراب و شباب کا چھلکنا، تاجروں کا افسران سے جوڑ توڑ قائم کرنا اور بے حسی کی زندگی بسر کرنا وغیرہ مسائل و موضوعات کو نہایت ہی فنکارانہ انداز سے اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے۔ مسلمان کا اجڑا اور لٹا ہوا گھر آباد ہو جاتا ہے مگر دو لاشیں اور ایک اغوا شدہ دوشیزہ کی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی لاشیں گرتی ہیں، دوشیزائیں اغوا ہوتی ہیں اور ہمارا معاشرہ شراب و شباب، اعلیٰ سوسائٹی، شاندار پارٹی، عشق و محبت، لہو و لعب میں گرفتار رہتا ہے۔ ہماری تہذیب و ثقافت، زبان و تاریخ سب کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے مگر یہ اتنا آسان نہیں ہے۔ اجڑے ہوئے مکان بس جاتے ہیں اور بستے رہتے ہیں۔ ظلم کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے۔ کانچ کا ٹکڑا نوکیلا اور دھاردار ہوتا ہے، اس کے چھونے سے انگلیاں کٹ سکتی ہیں، نوکیں چبھ سکتی ہیں۔ کلام حیدری نے اس افسانے میں کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ انھوں نے تشبیہات، استعارات اور علامات سے اس افسانے کو سجایا اور سنوارا ہے۔

'سخی' اس مجموعے میں شامل دوسرا اور کلام حیدری کے مقبول ترین افسانوں میں ایک ہے جسے کئی افسانوی انتخاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا اسلوب بیانیہ اور پیرایۂ بیان نہایت دلچسپ ہے۔ اس کے کردار مبہم اور غیر واضح ہیں۔ یہی ان کی خوبی بھی ہے۔ انھوں نے افسانے میں ڈرامائیت، جزئیات اور مکالموں کی خوبصورت پیش کش سے کام لیا ہے۔ افسانہ 'سخی' کا راوی واحد متکلم میں ہے۔ مرکزی کردار میں کلکتہ کا ایک بیڑی مزدور مولابخش ہے جو ہر مہینے اپنی بیوی سکینہ کو پورنیہ (بہار) سے کبھی چالیس، کبھی پچاس اور کبھی سو روپے منی آرڈر بھجواتا ہے۔ مولابخش چونکہ پڑھا لکھا نہیں ہے اس لیے وہ منی آرڈر ہر مہینے افسانہ نگار سے لکھواتا ہے۔ مولابخش پست قد گٹھا ہوا سیاسی مائل آدمی ہے، وہ بڑا محنتی آدمی ہے، شطرنجی ڈیزائن کی لنگی اور گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی پہنتا ہے۔ جو اس وقت کلکتہ کے مزدور طبقے کا فیشن تھا۔ افسانہ نگار ان دنوں کسی اخبار میں کام کی تلاش میں ہے، ایک اخبار کے ایڈیٹر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس ہوٹل میں آ کر اس سے ملاقات کرے گا۔ اس نے زکریا اسٹریٹ کے اس ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے سوچا

تھا کہ وہ اس ایڈیٹر سے کچھ ایڈوانس مانگے گا جس سے وہ زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں چند دن گزار سکے مگر کافی انتظار کے بعد بھی وہ ایڈیٹر نہیں آیا اور ترجمے کا وہ کام جس کا اس نے وعدہ کیا تھا وہ اسے نہیں مل سکا۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے اسے شیرمال اور کباب کی اشتہا انگیز خوشبو پریشان کرتی ہے۔ وہ تعلیم یافتہ ہے اور بے روزگار ہے، کوئی معقول سی نوکری کے لیے پریشان و سرگرداں ہے، نوکری نہیں ملتی تو وہ ترجمے اور اخبار میں کام کر کے اپنا وقت گزارنا چاہتا ہے مگر اس میں بھی اسے کامیابی نہیں ملتی ہے۔ وہ چار دنوں تک پریشان رہتا ہے۔ ہوٹل میں بیٹھ کر ایڈیٹر کا انتظار کرتا ہے مگر ایڈیٹر نہیں آتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ چار دنوں میں دوڑ دھوپ کر کے کوئی ٹیوشن ہی تلاش کر لیتا۔ وہ پریشان ہے، تنگ دستی کا شکار ہے۔ اس کی جیب میں اب محض پانچ آنے رہ گئے ہیں۔ اسی دوران مولابخش کے سامنے آتا ہے اور دریافت کرتا ہے کہ ''ہم کل آئیں گے، آپ رہیں گے نا'' دوسری صبح افسانہ نگار کی جیب میں محض دو آنے پیسے رہ گئے تھے۔ وہ سوچتا ہے کہ انگریزی کی جو ڈکشنری اس کے پاس پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کر لے۔ اسی دوران اچانک مولابخش آ جاتا ہے، منی آرڈر لکھواتا ہے، ''بی بی سکینہ، معرفت شرافت حسین، بیڑی دکان، پورنیہ۔ مولابخش، ساٹھ روپے'' تبھی مولابخش افسانہ نگار کو یہ بتاتا ہے کہ آج اس کے مالک نے اسے جلدی بلایا ہے، اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکتا۔ افسانہ نگار فوراً اپنی خدمت پیش کرتا ہے کہ وہ منی آرڈر لگا دے گا مگر مولابخش ایک پڑھے لکھے آدمی اور اپنے محسن و مددگار سے کام لینے سے ہچکچاتا ہے۔ مگر افسانہ نگار اسے راضی کر لیتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہے کسی کا ایک کام کرنے سے وہ چھوٹا نہیں ہو جائے گا۔ پہلے پہل جب افسانہ نگار نے مولابخش کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا ''معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجیے۔'' وہ ہر مہینے معرفتی میں اپنا نام و پتہ ہی لکھتا تھا۔ مولابخش چلا گیا، اب اس کی جیب میں منی آرڈر کے ساٹھ روپے رہتے ہیں۔ جسے بددیانتی کے ساتھ وہ ہڑپ کر جاتا ہے۔ شام ہوتی ہے تو وہ دلکشا ہوٹل میں جانے کے بجائے پارک سرکس کے اوسط درجے کے ہوٹل میں بڑی ہی بے فکری اور شانِ بے نیازی سے جاتا ہے، شیرمال، قورمہ، سیخ کباب کھاتا ہے۔ واپسی پر منی آرڈر کے فارم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کوڑے دان میں ڈال دیتا ہے۔ بعد میں اسے خفّت ہوتی ہے کہ اسے مولابخش سے بیس پچیس روپے قرض مانگ لینا چاہیے تھا مگر اسے دست سوال بڑھانے کے احساس سے ہی ذلت کا احساس ہوتا ہے۔ مگر وہ اندر ہی اندر ندامت کے احساس سے

بے چین و بے قرار بھی رہتا ہے۔اس کے کئی دن اچھے گزرے،تلاشِ بسیار کے بعد نوکری نہیں ملی،اب اس کی جیب میں بائیس روپے کچھ آنے رہ گئے تھے۔اس سے کئی دن مزید گزارا ہوسکتا ہے اور وہ دفتروں کے چکر بھی کاٹ سکتا ہے،اسی خیال میں گم وہ کولوٹولہ تک آجاتا ہے۔ناخدا مسجد کے سامنے اسے ایک لاش پڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ایک نوجوان آواز لگارہا ہوتا ہے ''ایک غریب مرگیا ہے،کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجیے۔'' وہ قریب جا کر دیکھتا ہے، فیتے سے بند ہونے والی گنجی،ایک کان کی کٹی ہوئی لَو، یہ مولا بخش تھا۔وہ نوجوان سے پوچھتا ہے۔یہ کیسے مرا،تو نوجوان بتاتا ہے کہ ٹرک سے کچل کر۔افسانہ نگار کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے اور وہ بائیس روپے کچھ آنے جو اس کی جیب میں پڑے تھے،اضطرابی کیفیت کے ساتھ اُس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی چلا جاتا ہے،وہ نوجوان اسے غور سے دیکھتا ہے۔

اِس افسانے میں کلکتہ کے محنت کش کی زندگی ہے۔غربت،افلاس،بیروزگاری،متوسط طبقے کے مسائل ہیں۔قاری پر اس افسانے کا اثر دیرپا رہتا ہے،یہی اس افسانے کی خوبی ہے۔کلام حیدری کسی بھی افسانے کے کردار کو کھولتے نہیں،خواہ وہ مولا بخش ہو،سکینہ ہو یا پھر وہ نوجوان۔ان کرداروں پر ایک دبیز سی چادر پڑی ہوتی ہے۔ایک غریب محنت کش کا پڑھے لکھے انسان پر اعتبار کرنا،وہ انسان جو ادیب بھی ہے۔راوی کا بحالتِ مجبوری بے ایمانی کرنا،پھر اس پر شرمندہ ہونا،بے روزگاری کا سامنا کرنا،سکینہ کا اپنے شوہر کے منی آرڈر کا انتظار کرنا وغیرہ وہ نکتے ہیں جسے افسانہ نگار نے خوبصورت انداز میں افسانے میں پرویا ہے اور مکمل ڈرامائی کیفیات سے پیش کیا ہے مگر افسانے کا آخری حصہ کافی اثر انگیز ہے۔مولا بخش کی لاش افسانہ نگار سے کیا کچھ سوال کرتی ہے؟ نوجوان اس سخی انسان کو غور سے دیکھتا رہتا ہے؟ راوی اچانک جیب میں پڑی پوری رقم کو اس لاش پر پھینک کر تیزی سے کیوں جانے لگتا ہے اور پھر مڑ کر کیوں دیکھتا ہے؟ ''سخی'' کون؟ سب سے بڑا سوال یہ ابھرتا ہے،راوی یا مولا بخش۔متوسط طبقہ پر محنت کش طبقہ کا اعتبار ہمیشہ قائم رہتا ہے۔مگر اس متوسط طبقے کو اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھنے کے لیے غلط راستوں پر بھی اکثر چلتے ہوئے دیکھا گیا ہے جو اس افسانے میں بھی ہوتا ہے۔

کیا افسانہ 'سخی' ایک ترقی پسند ادیب کے قلم سے تحریر کردہ ایک عمدہ افسانہ ہے؟ اس پر بھی گفتگو ہونا چاہیے۔

اس مجموعے میں شامل تیسری کہانی 'زندانی' موضوع،اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے ان کی

تمام کہانیوں سے مختلف ہے۔اس افسانے میں ایک ایسے نفسیاتی پہلو کو مَس کیا گیا ہے جس سے عام طور پر شادی شدہ جوڑوں کا واسطہ ہوتا ہے مگر وہ نوجوان عورتیں اور مرد اس زہر کے پیالے کو پی جاتے ہیں اور زندگی بھر حسرت و یاس میں تڑپتے رہتے ہیں۔شادی کے تعلق سے ہر مرد و عورت کے اپنے خواب ہوتے ہیں،اپنا ماضی ہوتا ہے،اس ماضی میں کئی تصویریں ہوتی ہیں،کچھ جذباتی رشتے ہوتے ہیں۔آرزوئیں، خواہشیں،تمنائیں ہوتی ہیں۔ان کا پیار ہوتا ہے۔مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کچھ حاصل ہوجائے،بعض چہروں کی کمی کا احساس زندگی بھر رہتا ہے جو ضمیر کو کچوکے بھی لگاتا رہتا ہے۔انسان ایک مصنوعی،دوہری زندگی جینے پر مجبور ہوجاتا ہے،اس افسانے کا موضوع یہی ہے جسے کلام حیدری نے کمال فنکاری سے پیش کیا ہے اور مرد و عورت کی نفسیاتی گرہیں کھولی ہیں۔

''سجاد اگر اس کا شوہر ہوتا، جیسے ایک جھنجھنی سی سارے رگ و پے میں
دوڑ گئی۔
یہ کیا ہے؟
ڈاکٹر کی بیوی بن کر اس نے پایا کچھ نہیں،کھویا شاید سب کچھ،یا سجاد کی
بیوی نہ بن کر ہی اس نے سب کچھ کھودیا۔
پانچ فٹ آٹھ انچ کا تندرست اور مسکراتا سجاد—— کالج کا وہ اسکرشن!
اجنتا کے اندر سجاد نے بے حد جذباتی ہوکر اس کے لبوں کو چوم لیا تھا تو
وہ چند لمحوں کے لیے پتھر کی مورت بنی وہیں گڑ گئی تھی۔''

(افسانہ 'زندانی')

فلیش بیک کی تکنیک اور داخلی جذبات و خواہشات کے تموج کو کلام حیدری نے حسن و سلیقے سے پیش کیا ہے۔سامنے حال ہے اور پیچھے پورا ماضی۔اس کی خوبصورت حسین یادیں۔اُن یادوں سے چھٹکارا بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا اور وہ زندگی اُسے اب کبھی مل بھی نہیں سکتی ہے۔وقت کے بہاؤ میں انسان کو بہنا پڑتا ہے۔زندگی گزارنا پڑتی ہے اور اسی میں بھلائی بھی ہے مگر ان یادوں کا کیا کیا جائے جو ہمیشہ جسم و جاں سے چمٹی رہتی ہیں،یادیں کوئی لباس،کوئی لبادہ تو نہیں جسے اتار کر پھینک دیا جائے۔کبھی کبھی پوری زندگی

گھُٹ گھُٹ کر بسر کرتے گزر جاتی ہے۔انسان زنداں میں مقید ہے۔ یہ زندگی کسی کی زندانی جیسی ہو کر رہ جاتی ہے۔ کلام حیدری نے ہر لمحے، کیفیات، جزئیات، جذبات، احساسات کو خوبصورت پیرائے میں ڈھالا ہے۔اس کہانی کا موضوع بھی کلام حیدری کی دیگر کہانیوں سے مختلف ہے۔عام طور پر ان کی کہانیوں میں جنسی معاملات وجذبات کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے، اس کہانی میں کمال ہنر مندی کے ساتھ انھوں نے ان مناظر کو پیش کیا ہے۔رواں اسلوب، مکالمے کی برجستگی اور خود کلامی کی تکنیک نے اس افسانے کو موثر اور کامیاب بنایا ہے۔

اس مجموعے میں شامل 'بابو' کلام حیدری کا ایک اہم افسانہ ہے۔تقسیم ملک، فسادات، سقوط پاکستان اور ان حادثات کے نتیجے میں پنپنے والے مسائل ومصائب کلام حیدری کے افسانوں کے بنیادی موضوعات رہے ہیں۔ ہجرت کے نتائج کتنے بھیانک اور تکلیف دہ ہوئے، مرد، عورتوں، بچوں، امیر، غریب سبھوں کو کتنی صعوبتوں سے گزرنا پڑا۔ان مواقع پر انسان کی داخلی شرافتیں اور خباثتیں بھی خوب خوب نکل کر آئیں۔ان ہی واقعات پر مبنی یہ افسانہ بھی ہے۔ایک زمانے میں یہ موضوعات ہی افسانوں اور ناولوں کے مرکز میں تھے۔افسانہ نگار اوسط تعلیم یافتہ گھرانے کا فرد ہے، اس کے والد سرکاری ملازم تھے۔وہ ہوسٹل میں مزے سے رہ کر اپنی زندگی گزار رہا تھا کہ اچانک اس کے باپ کی موت ہو جاتی ہے۔ بحالت مجبوری وہ ہوسٹل چھوڑ کر کھولا باڑی میں رہنے لگا۔ جہاں مزدور، محنت کش طبقہ اپنی مشکل بھری زندگی بسر کرتے تھے، تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں کے مکین افسانہ نگار کو احتراماً 'بابو' کہہ کر پکارتے تھے، افسانہ نگار سے یہ مزدور اپنے خط لکھواتے، منی آرڈر کے پتے لکھواتے۔افسانہ نگار اپنی نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ معقول زندگی بسر کر رہا تھا۔ایک روز 'لیٹین' ایک تالہ بنانے والی فیکٹری کا ملازم اچانک رات کے وقت اس کے کمرے میں آ گیا۔اس کے بازو میں کوئی گولی لگی تھی۔ جسے اس نے کپڑے سے باندھ رکھا تھا۔لیٹین نے ایک اٹیچی بطور امانت 'بابو' کو رکھنے کے لیے دی۔اس نے اٹیچی بابو کے پلنگ کے نیچے رکھ دی اور تیزی سے چلا گیا۔صبح جب افسانہ نگار کی آنکھ کھلی تو اس نے اٹیچی کو کھول کر دیکھا تو سو سو کے نوٹوں سے وہ اٹیچی بھری ہوئی تھی اور اس میں دو تین لاکھ روپے تھے۔افسانہ نگار خاموشی سے کھولا باڑی چھوڑ کر اس اٹیچی کو لے کر اپنے شہر چلا جاتا ہے۔وہ ایک بڑا کاروباری بن جاتا ہے اور نہایت ہی خوش حال زندگی بسر کر رہا ہوتا

ہے کہ اچانک بیس سال کے بعد 'لیٹین' اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔افسانہ نگار اپنے رسوخ سے لیٹین کو 'فاریز ایکٹ' میں گرفتار کرا دیتا ہے، اس کی پاداش میں وہ اب کبھی اس ملک کی سرزمین پر قدم نہیں رکھ سکتا۔

یہ پورا افسانہ امیر وغریب کی اخلاقیات اور کردار پر مبنی ہے۔ جو مزدور طبقہ تعلیم یافتہ 'بابو' پر اس قدر اعتبار کرتا ہے کہ وہ اپنی لاکھوں روپے سے بھری اٹیچی اسے رکھنے کے لیے دیتا ہے، دوسری طرف 'بابو' سے نہ صرف اسے دھوکا ملتا ہے بلکہ اس کی پوری زندگی بابو اجیرن بنا دیتا ہے۔اپنی خوش حالی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بابو، لیٹین کی پوری زندگی کو جہنم بنا دیتا ہے۔کلام حیدری نے اس افسانے کو فنکارانہ مہارت سے بُنا ہے۔ پہلے حال اور پھر ماضی کے واقعات کو سلسلے وار کڑیوں کی مانند جوڑا ہے۔اس افسانے میں زندگی کی سفاک حقیقتوں کا بیان بہترین انداز واسلوب میں کیا گیا ہے۔

'کس کی کہانی' اس افسانوی مجموعے میں شامل ایک نمائندہ کہانی ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ 'کس کی کہانی' کلام حیدری کی چند نمائندہ کہانیوں میں سے ایک اہم کہانی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔اس کہانی میں کلام حیدری ناسٹلجیائی کیفیت میں گرفتار اور خوبصورت یادوں سے سرشار ہیں۔ ماضی میں درد وکرب بھی ہے۔ ماضی نے کئی زخم بھی دیئے مگر اس ماضی میں ان کی 'آپا' بستی ہیں۔جن سے وابستہ ڈھیروں خوشگوار بچپن کی یادیں وابستہ ہیں۔ پل پل کی یادیں ان کے لیے اب سوہانِ روح بن چکی ہیں۔ ماضی کا سارا شیرازہ بکھر چکا ہے۔آپا شادی کے بعد بنگلہ دیش چلی گئیں، ان کے پیارے بہنوئی اور آپا کی زندگی صعوبتوں بھری گزرتی رہی، بیس سال کے بعد افسانہ نگار کا بھانجا اس سے ملاقات کے لیے آیا اور پھر ساری یادیں، ساری باتیں آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔'کس کی کہانی' میں ان ساری یادوں کو افسانہ نگار نے فنکارانہ سحر کاری کے ساتھ پیش کیا ہے، یہ کہانی بظاہر سادہ لگتی ہے مگر اسلوب میں ایک روانی ہے اور افسانہ نگار نے فنی شائستگی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اِس کہانی میں افسانہ نگار کا بچپن، نوجوانی کے ایام جدوجہد، تحریک سے وابستگی، مٹی کی سوندھی خوشبو سے والہانہ لگاؤ، بہن کا بے پناہ لاڈ پیار، بہنوئی کی محبتیں اور پھر بہن کی شادی، جدائی، درد والم کا حسرت ناک بیان ہے ان ساری کڑیوں کو افسانہ نگار نے اس افسانے میں خوبصورت پیرائے میں پیش کیا

ہے۔اگر کسی نے کلام حیدری کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کیا ہے ان کی حقیقی زندگی کا اسے علم ہے تو یہ افسانہ اور اس کے کردار، زماں ومکاں آئینے کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔

'کس کی کہانی' اپنے عہد کا سانحہ بھی ہے۔ بچپن میں آپا کی اتھاہ محبتیں اور لاڈ پیار سے بھری پُری زندگی ہے، جہاں آم کے باغ، اموڑیاں، چنے کے ستو کی روٹی، رسیاول، چاول کی روٹی، سیم بھات، پیٹھا اور اردو کے رسائل تھے۔ اپنوں کا پیار، اپنائیت بھرا ماحول اور خوشگوار فضا تھی، آپا کی شادی ایک خوبصورت نوجوان سے ہوجاتی ہے، جو اس کی آپا اور اسے بھی بے پناہ پیار کرتا ہے پھر قیام بنگلہ دیش کے بعد، افسانہ نگار کی آپا اپنے شوہر کے ساتھ بنگلہ دیش میں جا بسیں اور انھیں سخت مشکل بھرے حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بیس سال کے بعد اچانک ایک دن ان کا بھانجا آتا ہے تو ڈھیروں یادیں، باتیں عود کر آتی ہیں۔ افسانہ نگار کی بیوی رشتے کی اس شدت اور گہرے اتھاہ جذبات کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ مگر افسانہ نگار کی آنکھوں میں سارا ماضی تیر رہا ہے۔ وہ خود کلامی کرتا ہے:

''سرحدوں کی بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے، کیونکہ آدمی آدمی
کی دوری محض سرحدوں سے نہیں ہوئی، کوئی ایک سرحد تو نہیں۔ حدنظر
تک لکیریں ہی لکیریں ہیں، کس کو سرحد کہیے، کس کو بے معنی لکیر—
ہم تو ان لکیروں کے بیچ گم ہوگئے ہیں، ہم کہاں ہیں—''
(کس کی کہانی: کلام حیدری)

پوری کہانی پر ناسٹلجیا کا وفور ہے۔ افسانہ نگار اپنے سوئے ہوئے بھانجے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگتا ہے، اور پھر اپنے بھانجے سے لپٹ کر رونے لگتا ہے، بھانجا جاگ جاتا ہے، وہ حیران نظروں سے افسانہ نگار کو تکنے لگتا ہے، اسے شاید اِس شدت اور جذبات کا احساس نہیں۔ افسانہ نگار کہتا ہے:

''تم میرے بیٹے ہو، میرے بھانجے ہو، میری باجی ہو— میرے
دولہا بھائی ہو— تم ماضی بھی ہو، حال بھی ہو— تم مستقبل بھی۔''
(کس کی کہانی: کلام حیدری)

افسانہ نگار جذبات سے سرشار ہے، اسے اپنا ماضی، حال اور مستقبل اپنے اس بھانجے میں نظر آتا ہے۔ بیک وقت کئی ملے جلے جذبات اس پر غالب آجاتے ہیں۔ یہ کہانی کئی برسوں پر محیط ہے، جو اپنے وقت کی جیتی جاگتی تصویر بن کر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔

'الف لام میم' کلام حیدری کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے جو فروری ۱۹۷۹ء میں کلچرل اکیڈمی گیا سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل چودہ کہانیاں الف لام میم، قاتل، کچھ مت بولو، بازو کیوں کٹے، کہانی سنو گے، نامرد، شادی، خواب، پیکٹ، تاریخ اور جگہ، خودکشی، اور 'اب' شامل ہیں۔ کلام حیدری کے یہ افسانے پیچیدہ گہری اور دوررس حقیقت کے انکشاف کا مظہر ہیں۔ ان افسانوں کی تکنیک بھی مختلف ہے، مثلاً افسانہ الف لام میم میں شعور کی رو کی تکنیک ہے تو افسانہ نامرد کا انداز بیانیہ ہے۔ قاتل، نفسیاتی گرہوں میں الجھا افسانہ ہے تو، کہانی سنو گے، اور تاریخ اور جگہ، خود کلامی اور مکالماتی تکنیک میں تحریر کردہ افسانہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے افسانہ نگاری کے ضمن میں کلام حیدری کسی بندھے بندھائے اصول اور تکنیک میں قید نہیں ہیں بلکہ موضوع کی مناسبت سے ان کا قلم چلتا ہے اور ان کا بنیادی مقصد کہانی کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچاتا ہے۔ کلام حیدری شگفتہ، دلکش نثر لکھنے پر قادر ہیں۔ اپنے اسلوب میں وہ نت نئے تجربے کرتے ہیں۔ علامتوں، استعاروں اور تشبیہات سے وہ اپنی نثر میں حسن پیدا کرتے ہیں۔ نثر لکھتے وقت ان کی ذہانت وذکاوت اور فنکاری عود کر آتی ہے جس کا مظاہرہ انھوں نے الف لام میم کے افسانوں میں کیا ہے۔

اس مجموعے کا پہلا افسانہ بھی 'الف لام میم' ہے جو بلاشبہ کلام حیدری کا ایک شاہ کار افسانہ ہے۔ پینتالیس صفحات پر مبنی شعور کی رو کی تکنیک میں لکھا گیا یہ افسانہ کلام حیدری کی فنکاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ قادری، ریوا، اوران کے چند احباب تحریک آزادی کے متوالوں میں تھے۔ انھیں انقلابی گروپ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آزاد ہندوستان کا خواب تھا۔ آزادی کے بعد وہ ایک ایسے ہندوستان کے خواہاں تھے جس کی صبح کی سنہری کرنوں سے سبھوں کے چہرے روشن ہوجائیں، دل ودماغ، ماحول، فضا سب کچھ روشن ہوجائے۔ آزادی کی جدوجہد میں انھیں سخت صعوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی جانا پڑا مگر جب ملک آزاد ہوا، تو ان کے سارے خواب چکنا چور ہوگئے۔ یہاں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ فسادات، نفرت، عصبیت بھرے ماحول میں انھیں گھٹن ہوتی ہے۔ وقت کے

دھارے میں بہہ کر قادری اور ان کے تمام ساتھی بکھر جاتے ہیں۔ آئیڈیولوجی کی شکست کے مارے یہ نوجوان اپنی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ ریوا اٹیمک انرجی کے محکمے میں کام کرتی ہے، پرشوتم اعداد وشمار کا ماہر بن کر مرکزی حکومت سے وابستہ ہو جاتا ہے، اور قادری ایک کاروباری بن جاتا ہے جسے ادب کا حد درجہ ذوق وشوق ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد قادری کی ملاقات ریوا سے ہوتی ہے اور وہ دونوں ماضی کی یادوں میں کھو جاتے ہیں۔ اس دور کے ایک ایک واقعات کو وہ یاد کرتے ہیں۔ جھنڈا لیے کھڑے رہنا، لاٹھی کے ضرب سے کلائی کا ٹوٹنا، دروازے پر دیر رات پولیس کی دستک، دونوں ہاتھوں میں زنجیریں، جیل کی سلاخیں اور پھر بہت کچھ دنیا بدل چکی تھی۔ آئے دن نت نئے انقلابات اور تبدیلیوں کا سامنا تھا، بچپن اور جوانی کی ساری یادیں زندگی کی دوڑ دھوپ میں کھو سی گئیں۔ ملک تقسیم ہو گیا پھر بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ صرف ملک تقسیم نہیں ہوا دل بھی بٹ گئے۔ لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ وہ انقلابی گروپ جس میں آزادی کے متوالے تھے وہ صرف ہندوستانی تھے، وہ ہرگز ہندو، مسلمان کے مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں تھے، اب سب کچھ بدل گیا تھا۔ افسانہ نگار ریوا سے باتیں کرتا ہے:

''وہ جو نظام صاحب ہمارے مقدمے مفت لڑتے تھے، وہ کسی فرقہ وارانہ فساد میں مارے گئے... یہ سب کیا ہے قادری..... وہ..... نظام صاحب..... رائے کتنی بار سلاخوں کے اندر گیا وہ اسے باہر لائے—اور ..... وہ کون پاگل تھے جنھوں نے ہمارے اس شہر کو..... خیر چھوڑو..... کن کن شہروں اور شاہراہوں کا ماتم کیا جائے۔''

(الف لام میم— کلام حیدری)

اب ذرا اس افسانے کے مختلف صفحات پر رقم چند جملے ملاحظہ کریں جس سے اس افسانے اور کلام حیدری کو بھی سمجھنے اور جاننے میں مدد ملتی ہے:

''زندگی مسٹر نثار کبڈّی کا کھیل نہیں ہے، عشق بھی کوئی حقیقت نہیں ہے، حقیقت وہ ہے جو جبر ہم پر مسلط کر دیتی ہے..... جو اقتدار اور تحکم ہم پر تھوپ دیتا ہے، وہی حقیقت ہے..... وہی میرا تمھارا اور

ریوا کا نصیب ہے..... وہی میرا تمھارا اور ریوا کا حق ہے..... جبر کو قبول کر لینے کا نام نصیب ہے۔''

(الف لام میم، ص15)

''..... تو پیاری بہن!

بات یہ ہے کہ تم وہاں اجنبی گئی تھیں اور اجنبی ہی رہیں، بلکہ ایسا ہوا کہ انھوں نے تمھیں دشمن سمجھ لیا کیونکہ تم اپنی مٹی اور غیر مٹی کا فرق بھول گئی تھیں، تم نے دونوں مٹیوں کی خوشبو کا فرق محسوس کرنے کی کوشش نہیں کی، مگر ان معاملات پر کیا بات کروں؟— تم اکیلی تھوڑے ہی ہو۔ تم نے اپنی جیسی ہزاروں کو بے حرمت ہوتے دیکھا اور سنا..... اُن کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں، ان کی کوکھ اجڑ گئی— تمھارا کیا ہوا؟''

(الف لام میم ص39)

''تم نے اچھا کیا مسٹر نثار! ماضی کو یاد کرنا، اس سے جذباتی طور پر منسلک رہنے کو بیماری کا نام دیا جاتا ہے..... اور اس بیماری میں، میں گرفتا ہوں— ریوا بھی شاید..... شاید.....''

(الف لام میم، ص42-43)

''وہ ڈرائنگ روم سے ملحق ایک کمرے میں چلی گئی، میں نے ایک ہندی رسالہ ٹیبل پر سے اٹھا لیا، اردو کے ایک مشہور کوی کی 'گجلوں' کو پڑھنے لگا۔ ہندی میں گجلوں کے امکانات پر اداریہ پڑھا..... ریوا آ گئی تھی۔''

(الف لام میم، ص44-45)

''یہ میری دوسری بدنصیبی ہے— مجھے لکھ پتیوں کے بازار میں

ایک لیکھک سمجھا جاتا ہے، اور لیکھک جو اصل لیکھک نہیں ہیں، مجھے
صرف چیمبر آف کامرس کا وائس پریسیڈنٹ سمجھتے ہیں..... ریوا۔''

(الف لام میم، ص45-46)

''ریوا یہ کہہ کر اس طرح ہنسی، جیسے مسرت کا سارا عطر اس نے
اپنی ہنسی میں حل کرنے کے بعد اذیت کی تلخی بھی اس میں ملا دی
ہو—''

(الف لام میم، ص48)

''بات یہ ہے ریوا..... کہ میں کاروباری مصروفیتوں کے نیچے
ایسا دب گیا ہوں جیسے کوئی ملبہ ہوں، اٹھنا چاہتا ہوں مگر مجھے کاروبار
کے بوجھ اٹھنے نہیں دیتے..... یہاں تک کہ میں..... میں ماضی کو
صرف سایوں کے روپ میں دیکھ پاتا ہوں۔''

(الف لام میم، ص51-52)

پورا افسانہ اپنے فطری بہاؤ، شعور کی رو میں سفر کرتا ہے۔ تخلیقی زبان اور دلکش اسلوب اس کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ کبھی افسانہ نگار ایک آئیڈیولوجسٹ لگتا ہے، کبھی مفکر و مدبر اور فلسفی، اور کبھی ایک شکست خوردہ انسان، جو وقت کے بہاؤ میں، منجدھار میں خود کو چھوڑ دیتا ہے مگر اس کا ماضی اسے کچوکے لگاتا ہے۔ وہ بے بسی سے اب محض تماش بین بن چکا ہے، ایک بڑا کاروباری، مگر انقلابی دل اسے بے چین کیے رہتا ہے۔

بلاشبہ 'الف لام میم' کلام حیدری کی تمام کہانیوں میں امتیازی حیثیت کی حامل ہے، جس میں ہم کلام حیدری کی شخصیت کو بہتر طور پر سمجھ سکتے۔ ان کی فنکاری کی داد دے سکتے ہیں۔

کلام حیدری کے افسانوی مجموعے 'الف لام میم' میں شامل افسانہ 'کہانی سنو گے' اور 'تاریخ اور جگہ' کا موضوع بھی تقسیم ملک، فسادات، ہجرت اور اپنوں سے بچھڑنے کا غم ہے۔ کلام حیدری کی اکثر کہانیوں پر ایک خاص قسم کی ناسٹلجیائی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ ماضی کی کربناک اور دلخراش یادیں ان کے

دل و دماغ پر چھائی رہتی ہیں۔ بنگلہ دیش ہجرت کرنے والوں کے ساتھ جو بھی گزری، قتل و غارت گری، عورتوں، بچوں کے ساتھ جو برا سلوک ہوا، اسے یاد کر کے کلام حیدری کا قلم بے چین ہو اٹھتا ہے، اسی لیے اکثر کہانیاں ان ہی یادوں کے حصار میں مقید ہیں اس کی مثال یہ دو کہانیاں بھی ہیں۔

'کہانی سنو گے' میں کلام حیدری ماضی کے اُن ہولناک واقعات کو پیش کرتے ہیں، جب زبان کے مسئلے کو لے کر خوں ریزی ہوئی، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا۔ انسانی لاشوں کی صفیں بچھ گئیں، انسان حیوان بن گیا۔ اردو میں آویزاں نیم پلیٹ، سائن بورڈ پھینک دیے گئے۔ وہاں کے مکینوں کو قتل کیا گیا، تباہ و برباد کیا گیا۔ نفرت کے شعلے ان کی آنکھوں سے برس رہے تھے۔ لوگ خاموشی سے ڈھیروں روپے دے کر دلالوں کے ذریعے اپنی شناخت چھپا کر ایک ملک سے دوسرے ملک ہجرت کر رہے تھے۔ انھیں یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ صحیح سلامت منزل تک پہنچیں گے بھی یا نہیں۔ کلام حیدری اس موضوع کو فلسفیانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ اپنے داخلی درد و کرب کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتے ہیں، اس کہانی کا آخری حصہ کلام حیدری کی فکر کا نچوڑ ہے۔''

''کہانیاں اتنی ساری زبانوں میں کہی جاتی ہیں پھر بھی وہ ایک
ہی رہتی ہیں اور تم دونوں ایک زبان میں ہی کہانیاں سنانے پر مصر
تھے..... ایک ہی زبان۔

زبان کو، زبان والوں کی گردن کاٹنے، ان کا حق چھیننے کے لیے
استعمال کرنے والوں کو کہانیاں سنانا کبھی نہیں آسکتا..... کہانیاں ان
سے روٹھ جاتی ہیں..... الفاظ ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں.....

خوشبوؤں کے نام تو تم مختلف آوازوں میں رکھ سکتے ہو،
خوشبوؤں کو زبانوں کے ذریعہ تبدیل کر سکتے ہو— گلاب کی خوشبو،
ہر جگہ گلاب کی خوشبو ہوگی— کیوڑہ ہر زبان میں کیوڑہ مہکے گا.....''

(کہانی سنو گے— کلام حیدری)

کلام حیدری نے اپنے عہد میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو اپنے افسانوں میں فکری

انداز میں پیش کیا۔ یہ افسانہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

افسانہ 'تاریخ اور جگہ' میں بھی ایسے ہی درد والم کا بیان ہے۔ جب انسانوں کی ہولیکا جلی۔ آندھی آئی، کچھ آم گرے اور پھر تیز آندھی آئی ڈھیروں آم گر گئے، آندھیاں آتی رہیں، آم گرتے رہے، جب آم پیڑ سے جدا ہو جاتے ہیں تو اس پیڑ سے ان کا کوئی رشتہ نہیں رہتا ہے۔ پیڑ بھی بغیر پھل کے اُداس اُداس دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکانات خالی ہونے لگے۔ بستیاں خالی ہوگئیں۔ ہر کوئی اس درد کو سمجھ بھی نہیں پارہا تھا۔ چند لوگ انھیں روکنا چاہتے تھے مگر حالات کے ہاتھوں لاچار اور بے بس تھے، مگر ایسے دور میں بھی انسانیت کے بے شمار قصے سامنے آئے۔

''مہنگو نانا کے بیٹے کلدیپ ماما میرے پاس ایک سال پہلے آیا تھا..... کہہ رہا تھا مہنگو نانا پاگل ہوگیا ہے، بوڑھا ہوگیا ہے اور میرے سمیت ان سبھوں کو یاد کرتا ہے جو آندھیوں میں پیڑ سے ٹوٹ کر گر گئے تھے...... وہ یاد اس لیے کرتا ہے کہ پاگل ہے.... اگر مہنگو نانا، جو دوسادھ ہے اور جو سید عبدالعلیم کا نانا ہے، پاگل نہ ہوتا تو میرے مکان کی اس تنہا بچی ہوئی کوٹھری میں روزانہ دن ڈوبے ایک دیا کیوں جلاتا؟ کلدیپ ماما کے نیم پختہ مکان میں رہنے کے بعد اسے اس کوٹھری کی فکر کیوں ہے؟ نانا پاگل ہوگیا ہے—''

(تاریخ اور جگہ — کلام حیدری)

دراصل یہ صرف ایک گاؤں کا قصہ نہیں ہے بلکہ اس میں پورا ہندوستان بستا ہے۔ ہندوستان کے متعدد گاؤں، قصبوں کا یہی حال تھا۔ سیاست کی زد میں آئے ہوئے انسان بے گھری کا شکار ہو رہے تھے، وہ ہجرت کرنے پر مجبور تھے مگر گاؤں کے دوسرے مکین جو انھیں اپنا بھائی سمجھتے تھے، اس درد کو جھیلنا ان کے لیے مشکل تھا۔ کلام حیدری نے نہایت ہی فنکارانہ کمال کے ساتھ اپنی اس کہانی میں پیش کیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ 'قاتل' نفسیاتی گتھیوں میں الجھا ایک اہم افسانہ ہے۔ اعداد و شمار، علم ہندسہ، نجوم سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ افسانہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ بظاہر ایسا محسوس

ہوتا ہے کہ اس افسانے کا موضوع جنس ہے جبکہ ایسا نہیں۔ دولت کی فراوانی کبھی کبھی انسانوں کی فکر و سوچ کو سلب کر لیتی ہے۔ ان کے سوچنے کا نظریہ بدل جاتا ہے۔ کبھی کبھی دولت اسے پریشان کرنے لگتی ہے، دولت ہی اس کی دشمن ہو جاتی ہے۔ کلکتہ کا ایک دولت مند شخص جو عیاشیوں میں ڈوبا رہتا ہے، افسانہ کا راوی اس کا ملازم ہے، دولت مند شخص اعداد و شمار کے چکر میں پڑ کر اسے ایک رات ایک عورت کے ساتھ گزارنے کے لیے اصرار کرتا ہے، علم الاعداد کے مطابق دولت مند شخص یہ رات اس عورت کے ساتھ اگر گزارتا ہے تو اس کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ علم الاعداد کی رو سے یہ نمبر اسے راس نہیں آتا۔ راوی سختی سے دولت مند شخص کو اس عمل کے لیے انکار کر دیتا ہے اور غرّاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ دوسرے دن جب وہ آفس جانے کے لیے تیار ہوتا ہے تو ملازم اسے فون کرتا ہے کہ وہ دولت مند شخص جو ان کا مالک بھی ہے، بستر پر مردہ پڑا ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے کا عنوان 'قاتل' رکھ کر یہ سوال قائم کیا ہے کہ قاتل کون ہے؟ اس کی موت کا ذمہ دار کون ہے؟

اسی طرح اس مجموعے میں شامل کلام حیدری کا ایک افسانہ 'نامرد' ہے جو بیانیہ انداز میں تحریر کیا گیا کلکتے کے ایک غریب فٹ پاتھ پر زندگی بسر کرنے والے شوہر، بیوی کی کہانی ہے۔ افسانہ نگار افسانے کے آغاز میں کلکتہ کی تہذیبی اور کاروباری اہمیت، بالخصوص ہوٹل کلچر کو مفصل انداز میں بیان کرتا ہے اور یہ بھی کہ کس طرح ان ہوٹلوں نے بڑے آدمیوں کے بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ملک کے طول و عرض سے کاروباری اس شہر میں ان ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں اور اپنے کاروبار کو پروان چڑھاتے ہیں۔ افسانے کا راوی بھی کاروباری سلسلے میں کلکتہ جاتا ہے، ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے، صبح وہ دیکھتا ہے کہ فٹ پاتھ پر ایک سترہ سالہ عورت اپنے شوہر کو نل پر نہانے میں مدد کرتی ہے۔ پھر ایک کونے میں اینٹیں کھڑی کر کے چولہا بناتی ہے اور اپنا گھریلو کام شروع کر دیتی ہے۔ راوی اب روزانہ اُسے صبح و شام دیکھتا ہے، جب وہ نہیں نظر آتی تو اس کی آنکھیں متلاشی رہتیں۔ ایک دن پولیس کے دو سپاہی زبردستی اُس عورت کو اٹھا کر اپنے افسر کے پاس لے گئے اور دیر رات اسے واپس اسی فٹ پاتھ پر چھوڑ گئے۔ اس کے شوہر نے کوئی احتجاج نہیں کیا، عورت نے اسی وقت اپنے شوہر کو 'نامرد' کہا اور اس سے طلاق لے کر اپنا سامان گٹھری میں باندھ کر چلی گئی۔ اس نے شوہر سے کہا کہ تو میرے لائق نہیں ہے۔ چار روز کے بعد اخبار میں

خبر چھپی کہ اسی بڑے افسر کو اس عورت نے اس کے کمرے میں گھس کر رات گیارہ بجے تیز کٹار سے اس کا پیٹ چیر دیا۔ اُس افسر کا قتل کر دیا۔ راوی نے صبح میں دیکھا کہ اس کا شوہر بستر لپیٹ کر رکھ رہا ہے اور یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں جا رہا ہے۔ راوی سوچنے لگا کہ ’نامرد‘ کون ہے اس کا شوہر یا وہ خود جس کا وہ چشم دید گواہ تھا اور اس کے سامنے دو پولیس والے جیپ پر لا کر اس عورت کو چھوڑ گئے تھے اور وہ کونے میں چھپا یہ تماشا دیکھتا رہا اور اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔

یہ کہانی سماجی جبر، عورتوں کے ساتھ ظلم، بے انصافی اور سماج کے ایک بڑے طبقے کا خاموش تماش بین بنے رہنے کا قصہ ہے۔ دراصل افسانہ نگار، بڑے شہر میں آباد غریبوں کی مشکل بھری زندگی اور اس کی انارکی کو پیش کرتا ہے۔ کلام حیدری نے ہمیشہ سماجی ظلم و جبر اور بے انصافی کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی یہ کہانی بھی ہے مگر سب سے بڑا احتجاج ان کا یہ ہے کہ ہمارا سماج کب بیدار ہوگا۔ عام لوگ حقائق سے چشم پوشی کب تک کرتے رہیں؟ ظلم کے خلاف وہ آگے کیوں نہیں آتے؟ افسروں کا ظلم و ستم، بدکاری اور تاناشاہی رویے کا خاتمہ اِس جمہوری نظام میں کب ہوگا؟ کیا مظلوم کو کٹار اٹھانی پڑے گی اور جیل کی ہوا کھانی پڑے گی؟ بہرحال یہ کہانی کئی سوالیہ نشان قائم کرتی ہے۔

’کچھ مت بولو‘ کلام حیدری کی ایک بہترین کہانی ہے جو ان کے اِس مجموعے ’الف لام میم‘ میں شامل ہے۔ اس کہانی کا ’میں‘ اپنے دوست عباس کی آمد کے بعد ایک عجیب نفسیاتی خوف سے دوچار ہوتا ہے۔ دراصل عباس افسانہ نگار کا وہ دوست ہے جس نے نہایت ہی مشکل گھڑی میں افسانہ نگار (راوی) کی تعلیم کا خرچ اٹھایا تھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد آگے کی تعلیم کے لیے اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا تو اس کے اسکول کے دوست عباس کا خط آیا کہ وہ کلکتہ چلا آئے، اُس کی تعلیم، رہنے سہنے کا پورا انتظام اس کے ذمے ہوگا۔ وہ کلکتہ چلا گیا اور عباس جو خود مالی اعتبار سے کمزور تھا اس نے اپنا وعدہ ہر طرح نبھایا۔ عباس چائے کی دکان کھول کر اپنی زندگی بسر کر رہا تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد راوی اپنے وطن چلا آیا اور ایک خوش حال زندگی بسر کرنے لگے۔ تیس برسوں کے درمیان عباس کی افسانہ نگار سے ملاقات نہیں ہوتی ہے۔ البتہ ایک دو بار عباس ضرورتاً اس کے پاس خط لکھتا ہے۔ مجھے دو ہزار روپے کی ضرورت ہے، کیا میں وطن چلا آؤں تو چند ہزار کا انتظام ہو جائے گا۔ تقسیم وطن اور فسادات نے اسے کئی گہرے زخم دیئے تھے۔ مگر

افسانہ نگار نے اس کے کسی خط کا جواب نہیں دیا اور کسی طرح کی کوئی مدد نہیں کی۔ ایک دن علی الصبح سردیوں کے موسم میں افسانہ نگار کے دروازے پر اس کا دوست نیم مردہ حالت میں پڑا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ عباس بول نہیں سکتا تھا، وہ کوما میں چلا گیا تھا۔ تین دنوں کے بعد اس کی موت ہو گئی۔ کوما کی حالت میں عباس کی آنکھیں مسلسل اسے تکتی رہیں۔ افسانہ نگار کو محسوس ہوا کہ اس درمیان وہ بتاتا رہا کہ میری بیوی مر گئی، میرا ڈاکٹر بیٹا ذبح کر دیا گیا، میرا مکان..... اور افسانہ نگار اس سے آنکھیں چراتا رہا۔ عباس مر جاتا ہے۔ قبر میں اتارتے وقت بھی اسے محسوس ہوا کہ لاش بول رہی ہے کہ ’’تم نے اچھا کیا کہ کچھ نہیں دیا، کیونکہ مجھے زندہ نہیں رہنا تھا..... میں تمھارا قرض کیسے چکاتا۔‘‘ اسے محسوس ہوا کہ قبر کی مٹی اس کے گھر تک آ گئی ہے۔ اسے یاد آیا کہ جب آخری بار اس نے کفن کا ایک حصہ الٹ کر اس کا چہرہ دیکھا تھا تو وہ اسے ملامت کر رہا تھا اور ایسا لگا کہ وہ کہہ رہا ہے ’’میری ضرورت ہو تو میں اٹھ جاؤں؟‘‘

افسانہ نگار کی بیوی اس سے عباس کے بارے میں کئی سوالات کرتی ہے مگر وہ سچ نہیں بتا سکا۔ وہ دُزدیدہ نگاہوں سے بغلیں جھانکتا رہا۔

کلام حیدری نے اس افسانے میں یہ پیش کیا ہے کہ انسان بعض اوقات کس قدر بے حس اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی کو خوشگوار بنائے رکھنے کے لیے وہ اپنے سچے ہمدرد، محسن، غمگسار کو بھی بھول جاتا ہے۔ جس نے مشکل گھڑی میں اُس کا ساتھ دیا اس کی زندگی سنوارنے، سجانے میں معاون و مددگار رہا جب اس پر مشکل پڑتی ہے وہ پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرا شخص منہ پھیر لیتا ہے۔ دراصل کلام حیدری نے اپنی مختلف کہانیوں میں تقسیم ملک، ہجرت، فساد، قیام بنگلہ دیش اور ان کے تباہ کن اثرات پر کئی کہانیاں لکھی ہیں، اس کے ساتھ ہی انھوں نے سماجی برائیوں کو بھی اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ اس کہانی میں بھی ان ہی نکات کو پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی پیش کش زبان و اسلوب انتہائی اثر انگیز ہے۔

’گولڈن جوبلی‘ کلام حیدری کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے جو دی کلچرل اکیڈمی، گیا سے نومبر 1983 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں کل چودہ افسانے، گولڈن جوبلی، رات کتنی باقی ہے؟ ایک سال اور راستے سے ہٹا، روشنی کی ضمانت، وہ مکان، ایک ہزار آٹھ سو بیانوے، ٹرنک سے انگیج ہوں، ستر اور بے ستری، نوح کا بیٹا، کون پہچانے؟، بابا کہاں ہو؟، جزیرے، اور درویش کی صدا، قہقہے..... چھپے شامل ہیں۔

آخر میں کلام حیدری نے اپنی مختصر خودنوشت 'اپنی زندگی کے کچھ سچ' کو بھی اس مجموعے میں شامل کیا ہے۔

افسانوی مجموعہ 'گولڈن جوبلی' دراصل کلام حیدری کی افسانہ نگاری کے ارتقائی سفر کی داستان ہے۔ ان افسانوں میں وہ فنی سطح پر نئے تجربے بھی کرتے ہیں اور ماضی کی اذیت ناک یادوں میں گرفتار بھی نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے کے پہلے افسانے 'گولڈن جوبلی' کا اختتام اس جملے پر ہوتا ہے ''یہ زندہ رہنے والے لوگ اپنی عمر کی گولڈن جوبلی منانے والے کو مردہ دکھائی دینے لگتے ہیں؟'' حالانکہ مردہ وہی ہے، کیونکہ اس نے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگائی تھی۔ گولڈن جوبلی کسی شخص یا یادگاری شئے کے پچاس سال کی عمر کے بعد خوشی منانے کا نام ہے۔ یہاں اس لفظ کو کسی اور معنی میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ کہانی کے شروع میں الفاظ اور ان کے معنی پر ہی سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ کلام حیدری کے فن کی اہم خوبی ابہام ہے۔ وہ ابہام اور علامتوں کے کثرتِ استعمال سے بہت سارے سوالیہ نشان قائم کرتے ہیں۔ ان کی اس کہانی میں ایک ژولیدگی ہے۔ مسلسل قرأت کے بعد ہی قاری معنی اخذ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے، یہ بھی ضروری نہیں کہ افسانہ نگار کا مطمحِ نظر وہی ہو جو قاری نے اخذ کیا ہے۔ 'گولڈن جوبلی' بذاتِ خود سوال ہی ہے، جہاں افسانہ نگار آغاز میں دو سوال کرتا ہے۔ ''تم جیتے کیوں ہو؟'' اور ''تم زندہ کیوں ہو؟'' پھر الفاظ کی بحث شروع ہوتی ہے کہ کیا سوال، سوالیہ نشان کے ذریعے کرنا ضروری ہے۔ گویا یہ ایک وجودی بحث ہے۔ وجودیت کے فلسفیوں نے بھی اس طرح کے سوالات قائم کیے ہیں۔ ''میں ہوں'' جواب ملا ''ہاں'' تو سوال کیا کسی کے کہنے سے میں ہوں، یا میں خود ہی ہوں، وغیرہ۔ جدیدیت کی بنیاد جن فلسفوں اور نظریوں پر تھی ان میں وجودی فلسفہ زیادہ مشہور اور تباہ کن ہے۔ یہ کہانی ایک وجودی کہانی ہے جو شروع سے آخر تک ایک ہی سوال پر مرکوز ہے؟ وہ ہے ''ہم تم زندہ ہیں'' وغیرہ اور یہاں افسانہ نگار لفظوں کی حقیقت پر بھی سوالیہ نشان قائم کرتا ہے کہ الفاظ Fake ہیں جس سے سب Fake لگتا ہے۔ اس کے پاس اس کا جواب یہ ہے کہ ''میرے تمھارے اور ساری دنیا کے اوپر ایک Fake آسمان ہے۔ اس لیے میں زندہ ہوں، کیونکہ زندہ تو میں ذہنِ خالق میں ہی تھا، وغیرہ۔ اس کے بعد وہ اپنے دوست پرشوتم سے مخاطب ہو کر کئی سوالات کرتا ہے چونکہ وہ فائیو اسٹار ہوٹل کی چوتھی منزل میں ایک کمرے کی بالکنی سے زمین و آسمان اور

خصوصاً ہوٹل کے سوئمنگ پول کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسی وقت کئی سوال ذہن میں پنپ رہے تھے۔ وہاں سے اُس کی نظر نیچے ایک بوڑھے شخص پر پڑتی ہے جو خربوزوں کی قاشیں تراش تراش کر سوئمنگ پول میں تیرنے والوں کو بانٹ رہا تھا۔ یکا یک اس کو خیال آتا ہے کہ چھلانگ لگانے سے لوگ کہیں گے کہ یہ مر گیا۔ جبکہ واحد متکلم کی نظر میں الٹا ہوتا ہے یعنی وہی زندہ ہے۔ جو بے حس و حرکت ہیں وہ مردہ ہیں۔

کہانی میں طرح طرح کے سوالات، جو بذاتِ خود جواب ہی ہیں، پیش کیے گئے ہیں۔ جیسے حاکم انصاف، رحم و کرم، محبت کو Heritage نہیں بناتا ہے۔ وہ پتھروں ہی کو Heritage بنانے پر کیوں اصرار کرتا ہے، غلامی کراتا ہے، جبکہ عوام آپس میں ملاپ، دوستی، رشک، عشق، محبت، نفرت، دکھ سکھ کو ملا کر ملک کا مزاج بناتے ہیں، خوش ہونا انسانی تمناؤں کی معراج ہے۔ پھر اس کے ذہن میں سوال آتا ہے کہ راج شری کیا کر رہی ہوگی؟ حالانکہ وہ بھی Fake تھی۔ اور یاد کیا ہوتی ہے۔ یہ دراصل پرشوتم کا کردار وضع کر کے واحد متکلم کی خودکلامی ہے۔ پوری کہانی میں Fake کلیدی لفظ ہے، گویا ہر چیز Fake ہی ہے۔

گولڈن جوبلی ایک علامت ہے۔ یہ لفظ موت کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کہانی اپنے اندر وسیع معنی رکھتی ہے۔ مسلسل قرأت کے بعد معنی کی تہیں کھلتی ہیں۔ کلام حیدری جدیدیت کی فکر سے متاثر تھے جس کے واضح اثرات اس کہانی میں موجود ہیں۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ 'روشنی کی ضمانت' کا آغاز سوال سے ہوتا ہے، میں کس سے مخاطب ہوں، کس سے باتیں کر رہا ہوں وغیرہ۔ یہ کہانی کلام حیدری کی دیگر کہانیوں کی طرح خودکلامی، سوالات اور مبہم جوابات پر مبنی ہے۔ کلام حیدری انتہائی باریک اسرار و رموز کو معمولی انداز سے پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ جیسے قلم میرا ہے؟ لیکن میرا ہوتا تو جیب میں رکھتا، کسی فنکار کا قلم اس کا اپنا نہیں قوم کی امانت ہوتی ہے۔ جس کو وہ سِپر سے تعبیر کرتے ہیں۔ واحد متکلم کی خودکلامی سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا نام پریاگ ہے۔ جو قوم، ذات، مذہب، خاندان کے حدود و قیود سے آزاد ایک قلم کار صحافی ہے۔ اس کا بوڑھا باپ پچاسی سالہ گنگو گاؤں کے اپنے پرانے دو کوٹھری کے کچے مکان میں رہتا ہے۔ گنگو مشترکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور شاندار وراثت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو شام ہونے سے پہلے روزانہ چھوٹی سی اجاڑ اور پرانی مسجد کے پاس والے پختہ مکان کی طرف چل دیتا ہے جس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے۔

گنگو اس مکان میں اپنی جیب سے ماچس نکال کر دیا روشن کرتا ہے۔ وہ دیئے کو لے کر بڑے ہال کے بازو والے دونوں کمروں میں جاتا ہے، ایک منٹ دو منٹ وہاں رہتا ہے، پھر روشن دیئے کو لے کر ہال میں آ کر ایک طرف رکھ دیتا ہے۔ اس کا بیٹا پریاگ گنگو کو روکتا ہے، اسے اپنے ساتھ نئے مکان میں رہنے کے لیے بھی کہتا ہے، مگر گنگو کسی طرح اس کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس گاؤں اور مسجد کے پاس والے پرانے منہدم پختہ مکان سے اُس کا جنموں جنم کا رشتہ ہے جسے وہ اپنے جیتے جی ختم نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بار اسی پختہ مکان میں اس خاندان کا ایک پانچ چھ سال کا بچہ گھر میں گنگو کی آمد پر جب یہ کہتا ہے کہ گنگو آیا ہے، تو اس کے گھر والے اسے تھپڑ مارتے ہیں، ''بدتمیز، بے ہودہ، نکالو اس کو، گنگو کہتا ہے۔ کہو گنگو نانا'' اور تھپڑ کھا کر وہ گنگو سے لپٹ جاتا ہے۔ گنگو اسے مزید مار کھانے سے بچاتا ہے اور اپنے گمچھے کے ایک کونے میں بندھا ہوا گڑ کھلا کر اُسے چپ کراتا ہے۔ گنگو ہتھیلی پر دیا رکھ کر مسجد کے آنگن میں رکھ دیتا ہے اور اندھیرے آسمان کے اوپر مسجد کے گرے ہوئے مینار کو دیکھتا ہے۔ ''ہے بھگوان'' اس بوسیدہ پختہ مکان کی مالکن اُس کی دیّا، جس کا شوہر شہر میں ڈاکٹر ہے، وہ افطار کا سامان سینی میں رکھ کر گنگو کو پورے رمضان بھر دیا کرتی تھی جسے وہ موذّن صاحب کے حوالے کر دیتا تھا۔ اپنے گنگو نانا کے کاندھوں پر چڑھ چڑھ کر اُس کا نواسا محمد ابوذر یا محمد یٰسین میٹرک پاس کر گیا تھا۔ اسی مکان مالکن دیّا، کے سبھی بیٹے ایک ایک کر کے ایک انجانے سفر پر نکل چکے تھے اور دیّا کا شوہر ڈاکٹر بھی مر گیا تھا۔ گنگو اس سوال کا جواب چاہتا تھا کہ سب شہر کی طرف کیوں جا رہے ہیں اور پھر واپسی کا نام نہیں لیتے ہیں مگر گنگو کس سے پوچھتا۔ دیّا تو اِس ویران گھر میں بُلکنی دائی کے ساتھ رہتی تھی۔ گنگو کو ایک رات نیند نہ آنے کی وجہ اُسے سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے دائی کو آواز دی۔ بُلکنی بُلکنی۔ مگر بُلکنی، گنگو کو ہی پکار کر کہہ رہی تھی کہ بستی میں دیکھو کوئی ہے؟ گنگو دو میل کی دوری تک گیا اور کچھ مردوں اور عورتوں کو ساتھ لایا۔ سفید لباس دیا کو پہنایا گیا اور گنگو مسجد کے دروازے پر گر پڑا، جہاں اُس کا جلایا ہوا دیا روشنی دے رہا تھا لیکن روشنی کے لیے ضمانت نہیں تھی۔

جدید دور نے فرد کو تنہا کر دیا۔ یاسیت، تنہائی اور مشترکہ تہذیب کا آئینہ دار یہ افسانہ ایک علامتی اظہار ہے۔ گنگو، دیّا کا خادم تو ہوتا ہے، لیکن وہی اُس کا سب کچھ ثابت ہوا۔ اس کے تمام بیٹے اور ان کی بیویاں اپنی نئی دنیا کو بسانے اپنی جڑوں سے کٹ کر کہیں دور چلے گئے۔ اپنے بزرگوں کی وراثت اور یادگار

کو قائم رکھنے کے لیے دیّا اکیلی رہ گئی اور اسی گاؤں کے پختہ منہدم بڑے سے مکان میں اس کی روح قفس عنصری کو پرواز کر گئی، اس کا خادم گنگو، دیا کے مرنے سے پہلے اور مرنے کے بعد وفاداری نبھا گیا۔ بلاشبہ یہ افسانہ کلام حیدری کی ذہنی وسعت کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے زندگی کی جن کربناکیوں کا غیر معمولی طور پر سامنا کیا، ان کا مطالعہ کیا اسے اپنے فن میں سمونے کی کوشش کی۔ یہ افسانہ اپنے ابہام کی وجہ سے قارئین کی نظروں سے اوجھل رہا لیکن یہ کلام حیدری کا نمائندہ افسانہ ہے جو اُن کی تعیین قدر میں اہم ثابت ہوگا۔

'رات کتنی باقی ہے؟' کلام حیدری کا ترقی پسند نظریات کی عکاسی کرتا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے، جو بیانیہ اسلوب میں تحریر کیا گیا ہے جسے علامتوں کے ذریعے پراثر بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔ زمینداروں کا ظلم اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں بدلتے سماجی نظام، استحصال کے خلاف اُٹھتی آوازوں، نیا تشکیل پاتا ہوا سماج، گاؤں کی بدلتی ہوئی صورت حال کو کلام حیدری نے نہایت ہی فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں زمینداروں کا طنطنہ، اُن کے غرور و تکبر، غصہ و خفگی اور مزدور طبقہ کی بے چارگی، لاچاری، غربت اور ان پر ہو رہے زمینداروں کے ظلم کو ان کی علاقائی بولی ٹھولی اور الفاظ میں موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ برجستہ اور بیساختہ مکالمے اور ذیلی کردار اس افسانے میں جان پیدا کرتے ہیں۔

زمیندار حمید میاں، لاچار کسان گنگو اور گنگو کا بیٹا گوپی اس افسانے کے اہم کردار ہیں۔ گنگو کو پڑھتے ہوئے پریم چند کے ناول گئودان کے مرکزی کردار ہوری کی یاد آتی ہے جس نے ظلم سہنا، بھوکے رہنا، زمینداروں کی مار کھانا، گالیاں سہنا اپنا مقدر سمجھ رکھا ہے۔ مگر اسی افسانے کا ایک اور کسان 'راما' ایک احتجاجی کردار ہے۔ جو زمیندار سے آنکھیں ملا کر باتیں کرتا ہے۔ کسی طرح کا اسے خوف نہیں ہے۔ افسانہ میں رمیش بابو کسانوں میں بیداری لانے کی کوشش کرتے ہیں، کسان دل کی تشکیل دیتے ہیں، کسانوں کے غریب و مفلس بچوں کو پڑھائی کی طرف راغب کرتے ہیں اور ان کی آنکھوں کو ایک خواب عطا کرتے ہیں۔ زمیندار حمید میاں کا آہنی پنجہ کمزور پڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے، پھر بھی وہ ظلم کرنے سے باز نہیں آئے اور سبھی کسانوں بالخصوص گنگو اور گوپی کو نئی روشن صبح کا انتظار رہتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ رات کتنی باقی ہے؟ گاؤں کی مقامی ماگدھی زبان، مکالمے اور الفاظ جیسے اُسارہ، ستو، کلھیا، پرسٹکانا، ڈول، ستّو سانا، براہل جی،

ڈھبری، تاڑ، ڈھم کدّوں وغیرہ نے افسانے کو فطری اور اثر انگیز بنا دیا ہے۔

اس مجموعے میں شامل افسانہ 'ایک سال اور راستے سے ہٹا' پڑھنے پر کلام حیدری کے افسانے 'الف لام میم' کی یاد آتی ہے۔ وہی آئیڈیولوجسٹک کلام حیدری، جن کی آنکھوں میں آزادی کے خواب تھے جنھوں نے آزادی کی لڑائی میں طالب علمی کے زمانے میں حصہ لیا۔ جن کی آنکھوں میں آزادی کے بعد کا ہندوستان بالکل مختلف تھا، جو کچھ انھوں نے سوچا تھا، وہ نہیں پایا، تو وہ مایوسی اور افسردگی میں ڈوب جاتے ہیں جسے وہ سال کے آخری دن ڈائری میں ایک کردار کی زبان میں کہتے ہیں۔ ''آزادی منائی نہیں جاتی محسوس کی جاتی ہے، آزادی روٹی اور روزی کمانے کے حق کا نام ہے، منصوبوں اور ہندسوں کی پہیلیوں کا نام آزادی کس نے رکھ دیا.....''

اس افسانے میں کلام حیدری ماضی کے دھندلکوں میں کھو جاتے ہیں۔ آزادی کی کیسی آرزوئیں تھیں، کیسی شدید تمنائیں تھیں، کیسی قربانیاں تھیں، تمام نوجوانوں کس طرح رات کے اندھیرے میں انگریز حکومت کے خلاف دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرتے تھے، اپنا احتجاج درج کرتے تھے، اپنی امنگوں کا اظہار کرتے تھے، وہ نوجوان وقت کے بہاؤ، دھاروں میں بہتے گئے، وہ، وہ نہیں رہے جو وہ تھے۔ انھوں نے اپنی خواہش کے مطابق اپنی نئی دنیا بسا لی تھی اب وہ مارشل لا، ایڈمنسٹریٹر کی حمایت میں خبریں پڑھتے ہیں۔ رنگ برنگی، چمکتی، دھوکہ اور فریب کی دنیا کا حصہ ہو چکے ہیں۔ تبھی تو کلام حیدری افسانے کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ''زندگی کی سزا کاٹتے کاٹتے تھک گیا ہوں — یا خدا تیرا احسان ہے کہ سزا کا ایک سال کم ہو گیا — ایک سال اور راستے سے ہٹا۔''

کلام حیدری کے افسانے 'نوح کا بیٹا' میں بھی ان کی یہی بے چینی، بیقراری جھلکتی ہے، پریس کی آزادی میں دیمک لگ رہی ہے، غلامی کو محسوس کرنا بھی کبھی مشکل ہوتا ہے۔ سیاست، سرکاری محکموں میں حد درجہ بدعنوانی، بے ایمانی، ضمیر فروشی کا بازار گرم ہے۔ اس طرح کے خیالات افسانے میں موجود ہیں اور پھر وہی ماضی کے دھندلکے سے چھن چھن کر آنے والی روشنی کی کرنوں کو وہ تکتے ہیں:

''یعنی تمھاری سمجھ میں نہیں آیا کہ تم آج سے نہیں، ۴۲ء سے آج تک پاگل ہی رہے ہو! اور تم..... سن لو، پاگل ہی مرو گے بھی، کیونکہ تم

اگر صحیح الدماغ ہو جاتے تو VIP ہوتے، منسٹر ہوتے — سنا، یونیورسٹی میں Top کرنے والوں کے لیے پروفیسر ہل کے کالج میں جگہ نہیں تھی۔ تو تمھارے جیسے ..... ہاں، ہاں بڑے قابل ہو، کئی کتابیں لکھی ہیں، ساری زندگی سیاسی تجزیے کیے ہیں..... ایثار کیا ہے، اسکول سے نکالے گئے ہو..... جیل —''

معاف کرنا تمھیں جیل جانا بھی نہیں آیا —

جیل نہ جا کر — جیل جانے یا روپوش ہو جانے کی کسی سے سرٹیفکٹ کی ضرورت ہوتی ہے بس! — تو پھر جیل کاہے گئے تھے؟''

(نوح کا بیٹا، کلام حیدری)

پوری کہانی میں اپنے عہد کے سماج سے بیزاری، ناخوشی، افسردگی کا اظہار ہوتا ہے۔ مختلف اسکینڈل اور پارلیامنٹ میں غنڈوں کے دخل پر بھی شدید ناراضگی ہے۔ مگر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ لوگ اپنی وراثت پر نازاں ہیں اور یہ سب کچھ دیکھتے رہتے ہیں۔ افسانہ نگار کا خیال ہے کہ ناخلف وراثت نہیں ہوتا، نوح کا بیٹا ہوتا ہے۔ دراصل افسانہ نگار حاکموں کے حافظے کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔

کلام حیدری کے چند مزید افسانے ان کے چاروں افسانوی مجموعے کے علاوہ مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں جن میں ابھرتا سورج، غلطی، دریا وغیرہ اہم افسانے ہیں۔ کلام حیدری کے افسانوں کے موضوعات مختلف ضرور ہیں، مگر اکثر افسانوں میں فکر و خیال کی تکرار، یکسانیت اور ماضی زدگی کا احساس ہوتا ہے۔ پہلے افسانوں کے مجموعے 'بے نام گلیاں' کے بعد وقت اور حالات کے تحت انھوں نے ارتقا کی منزلیں طے کیں، ترقی پسندی کے بعد جدیدیت کی طرف ان کا رخ ہوا، ان کے متعدد افسانے جس کے گواہ ہیں۔ انحراف اور اختلاف کلام حیدری کی سرشت میں تھی۔ وہ بڑے سے بڑے ادیبوں کی منمانی شرطوں کو ماننے کو ہرگز تیار نہیں رہتے۔ کسی بھی شخص کے آگے جھک کر سمجھوتہ کرنا، اُس کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا، اُن کی سرشت میں داخل نہیں تھا۔ وہ کسی بھی بندھے ٹکے اصول و ضوابط اور روایت کے علمبردار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔ انھیں اپنے فن کو نیا رخ دینا اور نئی سمت عطا کرنے کا ہنر آتا تھا۔ انھوں نے زندگی

کا عمیق مطالعہ ومشاہدہ کیا تھا۔ وہ عملی انسان تھے۔ ان کے کئی نفسیاتی افسانے ان دیگر افسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ خوبصورت، دلکش، دلآویز نثر لکھنا جانتے تھے، کسی بھی واقعے کو افسانوی رنگ میں پیش کرنا انھیں سلیقے سے آتا تھا۔ وہ بلا کے خلاق، ذہین وذکی اور حساس فنکار تھے۔ قدروں کی شکست وریخت، سماج کے بدلتے منظرنامے، تہذیب کی ٹوٹتی بکھرتی فضا سے وہ حد درجہ افسردہ اور بیزار تھے۔ وہ ایک بیباک فنکار تھے جن کی اپنی نظر اور جن کا اپنا نظریہ تھا۔ اُس نظر اور نظریے میں بھلے ہی کوئی خامی ہو، مگر انھیں اپنے افکار و خیالات پر بلا کا اعتبار تھا۔ بیتے ہوئے لمحات اُن کی زندگی کے بیش قیمت اثاثے تھے۔ ان کے بچپن اور جوانی کے دن انھیں ہمیشہ کچوکے لگاتے رہتے تھے۔ وہ اپنے افسانوں میں بار بار ان ہی یادوں، فضاؤں میں کھو جاتے ہیں اور ان واقعات کو افسانوی رنگ میں ڈھالنے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ واقعات، یادیں جنھیں بھولنا ممکن نہیں۔ صنعتی دور اور مشینی زندگی میں انسان اپنی جڑوں سے کٹ سا گیا ہے۔ انتشار، بے یقینی، تشکیک، بیگانگی، انجانا خوف، پژمردگی نے اسے اپنے حصار میں لے لیا ہے، کلام حیدری کے افسانوں میں یہ اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے چند ناقدین نے کلام حیدری کے بعض افسانوں میں جدیدیت کے رجحانات کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں علامت استعاروں، تشبیہات نے نیا رنگ وآہنگ قائم کیا ہے۔

کلام حیدری کا تخلیقی رویہ مانگے کا اجالا نہیں ہے۔ ان کا مطالعہ ومشاہدہ عمیق اور بسیط ہے۔ انھوں نے کسی کی بھی کورانہ پیروی نہیں کی ہے۔ وہ اپنی بصیرت وبصارت سے کام لیتے ہیں۔ کلام حیدری پرانی اور نئی قدروں کے امتزاج سے اپنی افسانوی دنیا آباد کرتے ہیں۔ شگفتہ اور استعاراتی انداز بیان ان کے افسانوں کو قوت بخشتا ہے۔ چند یادگار کردار اور پیکر تراشی کے حسن نے ان کے افسانوں کو قارئین کے حافظے میں محفوظ کر دیا ہے۔ ان کے افسانوں میں ان کی ذہانت وذکاوت، خلاقی اور ان کے باطن کی بے چینی روشن اور عیاں ہے جو انھیں اردو کے چند ممتاز افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام عطا کرتی ہے۔

کلام حیدری کی صحافتی خدمات

صحافت کی اپنی ثقافت ہوتی ہے اور اس ثقافت کی تشکیل انھیں عناصر سے ہوتی ہے جو اس قوم کی ثقافت ہوتی ہے جس کی نمائندگی صحافت کرتی ہے۔ ایسی صورت میں صحافت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کا ایک حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر ہو۔ اپنے نقطۂ نظر کی پیش کش میں صحافت کو اتنا اٹل اور بے لاگ ہونا چاہیے کہ مسئلے کے تعلق سے اس کی رائے ایک معرکے کی صورت اختیار کرلے اور ایک سلیقہ مند نظریاتی جنگ معلوم ہو۔ یعنی صحافت جس قوم، علاقہ، خطہ یا ملک کی نمائندگی کرتی ہے، یہ نمائندگی اسی وقت نمائندگی کہلانے کا حق رکھتی ہے جب اس کی وابستگی بے لاگ اور واضح ہو۔ کسی قسم کی لاگ لپیٹ صحافت کی فکری وابستگی کو دھندلا کر دیتی ہے۔ اگر صحافت کے پاس فکر یا مسئلے کے تعلق سے کوئی مستحکم نظریہ نہ ہو تو ایسی صحافت کو ادبی صحافت نہیں کہا جائے گا۔ اس قسم کی صحافت میکانکی طور پر محض خبریں ہی پہنچاتی ہے، تجزیہ و تحلیل سے اسے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ جو صحافت رائے عامہ ہموار کرتی ہے یا ایسا کرنے کی کوشش کرتی ہے، وہ اپنا ایک مستحکم نقطۂ نظر بھی رکھتی ہے۔ اردو کی ادبی صحافت میں کلام حیدری بھی ایسے ہی صحافی گزرے ہیں جن کی نظر محض خبروں یا اطلاعات پر نہیں رہتی، جن کی نظر میں صرف مواد کی پیش کش ہی صحافت نہیں ہے بلکہ وہ ہر مسئلے کے تعلق سے اپنا ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور اسے پوری شدت کے ساتھ اس معاشرے تک پہنچاتے ہیں جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ نمائندگی کے اس عمل میں وہ کسی مصلحت کوشی یا پردہ پوشی کو روا نہیں رکھتے۔

کلام حیدری کا شمار ہندوستان کے ان چند صحافیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے اداریوں سے اپنے عہد کو حد درجہ متاثر کیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے مختلف شہروں سے کئی اہم ادبی رسائل و اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ بعض رسائل واخبارات کے مدیران ممتاز و نامور ادیب وشاعر اور نقاد تھے۔

چند رسائل ملک کے اہم شہروں سے پابندی سے شائع ہو رہے تھے اور ان کی ایک خاص دھاک جمی ہوئی تھی۔ ان کا اپنا ایک وسیع حلقہ تھا۔ نظری مباحث اور فکری گروہ بندی کے اس دور میں کلام حیدری نے صوبۂ بہار کے مردم خیز شہر 'گیا' سے ۱۹۶۳ء میں ہفتہ وار 'مورچہ' اور ۱۹۶۶ء میں ادبی ماہنامہ 'آہنگ' کا اجرا کیا۔ 'آہنگ' اور 'مورچہ' نے اردو صحافت پر گہرے نقوش قائم کیے۔ ان کے مطالعے سے ایک بات تو عیاں ہوتی ہے کہ کلام حیدری اردو زبان و ادب سے عشق کرنے والے وطن کے سچے سپوت تھے۔ ادب سے ان کی گہری وابستگی تھی اور اردو زبان سے والہانہ لگاؤ تھا۔ وہ بے خوف اور بے حد جرأت مند، نڈر، بیباک اور حق گو صحافی تھے۔

'مورچہ' اردو کا پہلا اخبار تھا جو 'ملکی دفاع' میں نکالا گیا تھا۔ ہندوستان پر جب چین نے اکتوبر ۱۹۶۲ء میں حملہ کیا تو حب الوطنی سے سرشار کلام حیدری بے چین ہو گئے اور انھوں نے چین کی جارحیت اور غاصبانہ حکمت عملی کے خلاف ایک مورچہ کھولنے کا فیصلہ کیا اور ہفتہ وار 'مورچہ' (۱۹۶۳ء) کا اجرا کیا جو نیم سیاسی اور ادبی اخبار تھا۔ اس اخبار نے اس عہد میں سیاست اور ادب کو خاصا متاثر کیا۔ کلام حیدری کے انتقال کے بعد 'مورچہ' کی اشاعت کے بارے میں شاہدہ حیدری (بیگم کلام حیدری) لکھتی ہیں:

> ''اسی زمانے کے آس پاس انھوں نے ہفتہ وار 'مورچہ' نکالا۔ یہ چین کے حملے کے دوران قومی دفاع کے لیے نکالا گیا تھا۔ کلام صاحب کو اس مورچے کے ذریعے اپنی بات کہنے کا ایک میدان مل گیا۔ ملازمت چھوڑ کر آزاد پیشہ اپنانے کا یہ ایک بڑا فائدہ تھا کہ وہ دل کھول کر 'مورچہ' کے اداریوں کے ذریعے اپنی بھڑاس نکالتے۔ نہ ستائش کی تمنا، نہ صلہ کی پروا۔ انھیں کسی بھی بے جا بات پر اپنے نشتر چبھونے کی آزادی تھی۔ 'مورچہ' کے تیز اور نوکیلے اداریے مقبول ہوتے چلے گئے۔''

'مورچہ' کے اداریوں کی اس زمانے میں دھوم تھی۔ اس زمانے کا کوئی بھی سیاسی، سماجی یا ادبی مسئلہ ہو، 'مورچہ' کے صفحات اور اداریے اسے پیش کرنے میں پیش پیش رہتے اور کلام حیدری اپنی بیباک

اور بے لاگ رائے دیتے۔ اپنے اور عوام کے جذبات کا اظہار بھی نہایت ہی موثر ڈھنگ سے کرتے۔ 'مورچہ' کے ۶/اپریل ۱۹۶۳ء کے اداریے میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

> ''پہلی بار اپنی اصلیت کے ساتھ ہندوستان پر حملے کی صورت میں چین کی بدنیتی کا اظہار ہوا۔ اس اچانک اور بالکل ہی مجرمانہ حملے کے پیچھے تسخیر عالم کا وہی جذبہ کام کر رہا تھا جس نے چنگیز اور ہٹلر کو تاریخ عالم میں رسوا اور خوار کیا مگر کسے معلوم تھا کہ چنگیز نے ماؤ چاؤ کی صورت میں پھر جنم لے لیا ہے اور ایک ہندوستان کو ہی نہیں، ساری دنیا کو چنگیز کے وارثوں سے خطرہ ہے...
>
> ... ہمیں چین کی فوجی تیاریوں سے باخبر رہنا ہے، اپنی طاقتوں کو جمع کرنا ہے، دفاعی تیاریوں میں مشغول رہنا ہے۔ عوام کو بہتر طور سے اس سے آگاہ رکھنا ہے کہ چین ایک مستقل خطرہ ہے۔ آزادیٔ وطن کے لیے ہم کو ہر طرح کے ایثار کے لیے تیار رہنا ہے۔ بیدار قوموں کو ایک چین کیا ہزاروں چین بھی شکست نہیں دے سکتے۔ ہمیں بیدار رہنا ہے۔''

یہی وہ خالص حب الوطنی کا جذبہ اور ملک پر مر مٹنے کی خواہش ہے جو اس عہد کے دیگر اخبارات میں 'مورچہ' کو ممتاز و منفرد بناتی ہے۔ کلام حیدری نے 'مورچہ' میں 'فتح ہماری ہے'، (۲/مارچ ۱۹۶۳ء)، 'چین ایک مستقل خطرہ' (۶/اپریل ۱۹۶۳ء)، 'یہ کیا تماشہ ہے' (۱۳/جولائی ۱۹۶۳ء)، 'چین کا ایٹمی خاکہ اور ہمارا دفاع' (۲۴/اکتوبر ۱۹۶۴ء) کے عنوان سے اداریے لکھ کر چین کی غلط پالیسیوں اور اس کی بدنیتی کو ظاہر کیا اور ہندوستانی حکومت و عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور جب پاکستان کے غلط اور ناپاک قدم ہندوستان کی طرف اٹھے تو انھوں نے 'ہماری سرحدوں پر پاکستانی لٹیروں کی فائرنگ' (۲۷/مارچ ۱۹۶۵ء)، 'حملہ آور پاکستان' (۱۵/مئی ۱۹۶۵ء) کے عنوان سے اداریے لکھ کر پاکستان کی غاصبانہ پالیسیوں اور ناپاک ارادوں سے ہندوستانی عوام کو آگاہ کیا۔ ان کے علاوہ کلام حیدری نے 'ہند و پاک تعلقات اور شیخ

عبداللہ' (۶ر جنوری ۱۹۶۸ء)، 'مشرقی بنگال میں بہاری' (۲۴ر اپریل ۱۹۷۱ء)، 'مشرقی بنگال کا ۱۹۴۲ء' (۸ر مئی ۱۹۷۱ء)، 'بڑی طاقتوں کا رویہ' (۲۶ر جنوری ۱۹۷۱ء)، 'خانہ ساز دستور پاکستان' (۳ر جولائی ۱۹۷۱ء)، 'بنگلہ دیش کے لیے جنگ' (۱۰ر جولائی ۱۹۷۱ء)، 'ہم اکیلے ہیں' (۲۴ر جولائی ۱۹۷۱ء) اور 'اسرائیل یا نازی' (یکم جولائی ۱۹۶۷ء) جیسے عنوانات سے مختلف مواقع پر اخبار 'مورچہ' میں اداریہ لکھ کر عوام کے ذہن کو بیدار کرنے اور جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔

ملکی دفاع کے موضوعات کے علاوہ کلام حیدری نے زبان اور تعلیم، فرقہ وارانہ فسادات، سیاسی، سماجی، اخلاقی، انتظامی پستیوں، سیاسی جماعتوں اور فرقہ پرست تنظیموں پر بھی کھل کر لکھا۔ کہیں بھی موقع پرستی اور مصلحت کی چمک سے ان کے پیر نہیں ڈگمگائے۔ مورچہ کے ۲۳ر مارچ ۱۹۶۷ء کے اداریے میں لکھتے ہیں:

''دانشورو، ادیبو، شاعرو! دلوں کو ٹٹولو۔ یہ انقلابی جرأت اور تاریخی ہمت تم میں ہے؟ اپنوں کو ٹوکنے سے بڑھ کر کٹھن شاید ہی کوئی کام ہوتا ہے۔ مگر یہ کٹھن کام بھی کرنا ہے۔ اس متھے ہوئے سمندر کے زہر کو پی جانے کے لیے کوئی نیل کنٹھ تو ہونا چاہیے۔''

کلام حیدری سچے ادیب اور بے خوف صحافی اور قوم و ملک کے حقیقی بہی خواہ تھے۔ انھوں نے نہایت ہی صاف ستھری زندگی گزاری۔ کسی طرح کا اختلاف ہو وہ فوراً دوٹوک اس کا اظہار کرتے۔ ان کی شخصیت کی پوری جھلک ان کے اخبار 'مورچہ' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ تقریباً بائیس برسوں تک وہ 'مورچہ' نکالتے رہے۔

ابتدا میں 'مورچہ' لیتھو پریس میں شائع ہوتا تھا۔ پہلے پتھر اور بعد میں جستے کی پلیٹوں پر شائع ہونے والے اس اخبار کی اشاعت کے لیے ایک پورا عملہ اور لیتھو مشین بھی تھی۔ اخبار صاف ستھرا چھپے اس زمانے میں یہ بڑا مسئلہ تھا۔ کلام حیدری کو اپنے اس اخبار سے عشق تھا۔ وہ بڑے تاجر ضرور تھے لیکن اخبار کے لیے پورا وقت دیتے۔ اس کے ادبی معیار کے ساتھ ساتھ طباعت و کتابت پر بھی حد درجہ توجہ دیتے۔ وہاب اشرفی اور محمود ہاشمی کا تاریخی ادبی معرکہ اسی اخبار میں شائع ہوا تھا۔

کلام حیدری نے ہفتہ وار اخبار 'مورچہ' کے بعد ادبی رسالہ ماہنامہ 'آہنگ' کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ 'آہنگ' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آیا۔ ابتدا میں اس کی قیمت ۸۵ پیسے تھی۔ اس کے ایک شمارے میں (جس میں ماہ و سال درج نہیں ہے) غیاث احمد گدی، جوگیندر پال، شفیع جاوید، جیلانی بانو کے افسانے اور شمس الرحمٰن فاروقی، وہاب اشرفی کے مقالات شامل ہیں۔ اختر قادری، زیب غوری، بشیر بدر، احتشام اختر کی شعری تخلیقات اور حسن نعیم 'ایک شاعر، ایک مطالعہ' کے تحت حسن نعیم کی پچیس غزلیں اور اختر یوسف کا حسن نعیم پر مضمون 'پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی' بھی شامل ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے آہنگ کو شہرت حاصل ہوگئی۔ اسی شمارے میں برٹینڈر رسل کے انتقال پر کلام حیدری نے بے حد اثر انگیز تعزیتی نوٹ لکھا تھا اور ماہنامہ 'آہنگ' کے موقف کو بھی ظاہر کیا تھا۔ رسالہ کی اشاعت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''آہنگ کسی مخصوص ادبی نظریے کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شائع نہیں کیا جارہا ہے اور کسی ایسے ماہنامے کو جو ادبی کہلانا پسند کرے اپنے اوپر یہ فرض عائد بھی نہیں کرنا چاہیے۔ ہر چند کہ اردو کے ادبی رسائل کا مروجہ ڈھب بہت کچھ ایسا ہی ہے۔

... ادبی رسالے کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ ادب کے ذوق کو عام کرے۔ اسے پھیلائے، فروغ دے، وسیع سے وسیع تر کرے۔ اسے وسیع المشرب ہونا چاہیے۔ اسے پڑھنے اور بہت کچھ پڑھنے کی دعوت دینی چاہیے۔ اسے کسی نظریے، کسی تحریک کا مبلغ بن کر ذوقِ ادب کے چاروں طرف حصار نہیں کھینچنا چاہیے۔''

'آہنگ' کے قارئین کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ اس عہد میں کئی اہم ادبی رسائل شائع ہو رہے تھے لیکن 'آہنگ' کا اپنا مخصوص انداز تھا جس میں نئے پرانے سبھی تخلیق کار حد درجہ دلچسپی لے رہے تھے۔ ان کی تخلیقات شائع ہو رہی تھیں۔ اس عہد کے نامور ممتاز افسانہ نگاروں، نقادوں اور شاعروں کی تخلیقات 'آہنگ' میں شائع ہوئیں۔ خطوط کا کالم بھی بے حد دلچسپ تھا۔ شمارہ ۵ میں باقر مہدی، عمیق حنفی، شمس الرحمٰن فاروقی، ابوذر عثمانی اور علی جواد زیدی کے بحث انگیز خطوط شائع ہوئے۔ اسی طرح شمارہ نمبر ۳

میں انور سدید، منظر شہاب، کوثر چاند پوری، حامد اکمل، من موہن تلخ اور قرۃ العین حیدر کے خط شائع ہوئے۔ گویا یہ کہ اس عہد کے فنکار بے حد توجہ اور دلچسپی سے 'آہنگ' کا مطالعہ دور دراز بیٹھ کر کرتے اور ادبی مباحث میں شامل ہوتے۔ اپنی رائے کا برجستہ اور برملا اظہار کرتے۔ 'آہنگ' کے کئی شمارے اس عہد کے نئے فنکاروں مثلاً شوکت حیات، سلام بن رزاق، انور خاں، عبدالصمد، علی امام اور حسین الحق کے تین افسانے اور ان تخلیق کاروں کے تاثرات 'میں کہانی کیوں لکھتا ہوں' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

اس عہد میں گیا ایک اہم ادبی مرکز بن چکا تھا جہاں شاہد احمد شعیب، وہاب اشرفی، محمد مثنیٰ رضوی، علیم اللہ حالی، تاج انور، حسین الحق، عبدالصمد، فرحت قادری، سید محمد حسنین، افصح ظفر، منصور عالم، سید احمد قادری، حق اعظمی، سرور عثمانی، بدنام نظر، فردوس گیاوی جیسے قلم کار تھے اور کلام حیدری صاحب کا دولت کدہ 'رینا ہاؤس' بیرونی ادیبوں و تخلیق کاروں کا مرکز تھا۔ اس کی واحد وجہ کلام حیدری کی مقناطیسی شخصیت اور 'آہنگ' کا جادوئی اثر تھا۔ احتشام حسین، آل احمد سرور، خلیل الرحمٰن اعظمی، سجاد ظہیر، راہی معصوم رضا، غیاث احمد گدی، احمد یوسف، الیاس احمد گدی اور حسن نعیم سبھی 'آہنگ' کے مدیر کی کشش میں گیا تشریف لاتے۔ کلام حیدری پوری تندہی سے گیا جیسے گمنام شہر سے ذاتی خرچ سے ادبی ماہنامہ 'آہنگ' شائع کر رہے تھے جس میں اس عہد کی بہترین تخلیقات شائع ہو رہی تھیں۔ علمی مقالات چھپ رہے تھے اور بحث انگیز تحریریں لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ کلام حیدری 'آہنگ' کے جنوری، فروری ۱۹۷۸ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

> 'آہنگ کوئی منصوبہ بند رسالہ نہیں، اس لیے کہ یہ دہلی یا بمبئی کی جگمگاتی، چکا چوند کرنے والی ان روشنیوں سے محروم ہے جو اندھیروں کو دور کرنے سے زیادہ خود اپنی روشنی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ آہنگ قصباتی اندھیروں سے لڑنے اور لڑکھڑا کر پھر لو کو تیز کرنے والا ایک دِیا ہے جسے ایک ادبی فقیر نے اس لیے جاری کر رکھا ہے کہ ادب کے شہنشاہوں کی ملکیت میں فقیر نہ ہو تو ادب تپسیا سے محروم رہ جائے گا۔''

'آہنگ' کے چند شماروں پر نظر ڈالتا ہوں۔ 'آہنگ' ۱۹۷۱ء شمارہ ۱۲ میں سلام بن رزاق، شفق،

نعمان ہاشمی، شمس ندیم ارج کے افسانے اور کلیم الدین احمد، عابد رضا بیدار، مثنیٰ رضوی کی نثری تحریریں شامل ہیں۔ 'آہنگ' ستمبر ۱۹۷۱ء شمارہ ۱۵ میں مرتبین میں کلام حیدری اور پرکاش فکری کے نام شامل ہیں اور عادل منصوری، شاذ تمکنت، خلیل مامون اور حسن فرخ کی نظمیں شامل ہیں۔ 'آہنگ' دسمبر ۱۹۷۱ء شمارہ ۱۸ میں مزامیر عنوان کے تحت وزیر آغا نے اداریہ تحریر کیا ہے جس میں انھوں نے زور دیا ہے کہ ادب دریافت اور تخلیق کا عمل ہے، تقلید اور تشہیر کا نہیں۔ جو لوگ مقصدیت کے سنہرے نام کا حوالہ دے کر لوگوں کو ایک خاص قسم کے عمل پر اکساتے ہیں۔ اچھے لیڈر اور مصلح تو شاید قرار پائیں گے اچھے ادیب کبھی نہیں بن سکتے۔ اسی شمارے میں بلراج مین را، قاضی عبدالستار، حسین الحق اور شبیر احمد کے افسانے بھی شامل ہیں۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ 'آہنگ' میں آہستہ آہستہ چند تبدیلیاں بھی ہوئیں۔ شمارہ ۲۵ اور ۲۶/ جولائی اگست ۱۹۷۲ء میں مزامیر کے تحت کلیم الدین احمد کی تحریر اداریہ میں شامل ہے۔ پرکاش فکری کا نام مرتبین میں باقاعدہ شامل ہو گیا۔ البتہ 'آہنگ' کے احتشام حسین نمبر میں مرتبین کی فہرست میں وہاب اشرفی اور تاج انور کے نام بھی مع تصویر شامل ہیں۔

'آہنگ' کے مشمولات گراں قدر تو ہوتے تھے لیکن سب سے زیادہ بحث انگیز، فکر انگیز اور بیش قیمت کلام حیدری کے اداریے ہوتے تھے۔ جہاں انھیں کوئی ایسا عمل نظر آتا جس پر خاموش نہیں رہا جا سکتا تو ان کا قلم چل نکلتا کیونکہ بقول کلام حیدری:

> ''آج خاموشی کو آرٹ بناتے ہوئے کہاں کہاں ایمانداری کا قتل ہو جائے گا۔ مجھے اس سے بڑا ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ زندگی میں زندہ رہنے کے لیے پتہ نہیں کب اور کتنی بے ایمانیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔''
>
> (آہنگ، فروری، مارچ ۱۹۷۶ء)

کلام حیدری کا قلم سچ رقم کرتا رہا۔ لوگوں کے زخم ہرے ہوتے رہے۔ 'آہنگ' کے صفحات میدانِ کارزار بنے رہے۔ قارئین کی دلچسپی میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا۔ ادب کے مہنت بگڑتے رہے۔ کلام حیدری مسکراتے رہے۔ ان کا قلم سبک تلوار بنا رہا۔ 'آہنگ' اگست ۱۹۷۰ء کے اداریے میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

''ادب کسی فیکٹری کا پروجیکٹ نہیں کہ اس پر کسی ٹیسٹ ہاؤس کی مہر لگ جانے سے معیار کی سند مل گئی اور اس کے بعد بازار میں اس کے معیار پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ ٹھپہ لگانے کی بدعت سے ٹھپہ دیکھ کر ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے اور اسے عروج تک پہنچانے کا کریڈٹ ترقی پسند مصنّفین کے مہنتوں اور قاضیوں کے سر ہے۔ کسی شاعر، اخبار نویس اور نقاد کی تخلیق و تحریر پس پشت رہی۔ اس کی پیشانی پر مہر کی تلاش ہوتی تھی۔ اگر وہ مہر لگی ہوئی ہے تو اس کی عظمت مسلم اور ادب میں اس کی جگہ مستقل اگر نہیں ہے تو وہ غیر معیاری اور مہمل۔ اس ٹھپہ ماری کے عہد میں کتنے ہی ہونہار نئے ذہن برباد ہو گئے جو پھر ادب کی طرف پلٹتے ہی نہیں۔

... ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے ہندوستانی ادب کو بہت کچھ دیا۔ اس کی دین سے انکار کور بینی اور تعصب ہے لیکن اس تحریک میں چند مہنت اور قاضی تھے جنھوں نے ایک دوسرے کو اس منصب پر فائز کر لیا تھا اور یہ تخلیق و خالق پر مہریں لگایا کرتے تھے۔ آخر ان ہی قاضیوں نے اسے دفن بھی کیا۔ جدید ادب کو سب سے بڑا خطرہ ٹھپہ لگانے والی بدعت سے لاحق ہے۔ جدید ادب کی نئی نئی آزاد مملکت میں مہنت اور قاضی پیدا ہو گئے تو یہ اسے بھی رسوا کریں گے۔ ترقی پسند مصنّفین ایک تنظیم تھی۔ اس میں کسی قدر ڈسپلن اور ضبط بھی تھا مگر جدید ادب کوئی تنظیم نہیں ہے۔ اس لیے اس کو مہنتوں سے زیادہ خطرہ ہے۔''

'آہنگ' کے شمارے اس امر کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ رسالہ کسی ادبی مہنت کے آگے سرنگوں نہیں ہوا۔ آزاد خیالی اور ہر طرح کی مصلحتوں و آلائشوں سے پاک ہونے کی وجہ سے ادیب و فنکار اس سے

منسلک ہوتے گئے۔ 'آہنگ' نے ادبی چپقلشوں اور گروہ بندیوں کے زمانے میں طرف داری سے کام نہیں لیا۔ کسی خاص نظریے یا تحریک کا وکیل بن کر نہیں رہ گیا۔ 'آہنگ' کے فروری، مارچ ۱۹۷۶ء کے شمارے میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

''جب قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو لگتا ہے تمام آلائشوں سے پاک ہو گیا ہوں ہر مصلحت اور خوف سے اوپر اٹھ گیا ہوں اور تب خاموشی ممکن نہیں ہوتی۔ خاموشی برداشت نہیں ہوتی۔ خاموشی بے ایمانی لگتی ہے۔

... ادیب اور خالق پر کیسا وقت آن پڑا ہے، فنکار کو سچ بولنے کے لیے کتنی چیزیں تیاگ دینی پڑتی ہیں، کتنے فائدے، کتنی کامیابیاں۔ بس سچ کے لیے، صرف فنکاری کے لیے... اے مستقبل یاد رکھنا۔ اے حال گواہ رہنا۔ ہماری زبان قتل ہوتی رہی، مگر ہم نے سچ بولنا نہیں چھوڑا۔ قلم سے وفاداری سے بڑی وفاداری ہم نے قبول نہیں کی۔''

کلام حیدری نے قلم سے وفاداری کی۔ لکچر شپ کی نوکری چھوڑ کر صنعت کار بنے۔ صاحب ثروت تھے، قلم کے بھی دھنی تھے، اس لیے کبھی بھی کسی طرح کے دباؤ میں نہیں آئے۔ انھیں نوکری میں ترقی پانے، شہرت اور دولت حاصل کرنے کی ہوس نہیں تھی۔ وہ تو خود کو ایک ادبی فقیر سمجھتے رہے اور ادب کے لیے تپسیا کرتے رہے۔ تاریخ گواہ ہے، 'آہنگ' کے شمارے گواہ ہیں کہ انھوں نے کسی بھی طرح کے تعصب کو داخل نہیں ہونے دیا۔ 'آہنگ' کے دروازے سبھی کے لیے وا تھے۔ ترقی پسند و غیر ترقی پسند کی دیوار کھڑی نہیں تھی۔ انھوں نے سبھی اہم قلم کاروں کے مضامین اور تخلیقات شائع کیے۔ ہاں عجلت پسند نوجوان ادیب جو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچنا چاہتے ہیں ان کی سخت خبر بھی لی۔ 'آہنگ' کے دسمبر ۱۹۷۰ء کے شمارے میں لکھتے ہیں:

''آج ہر چیز بہت جلد حاصل کر لینے کی ہوس اتنی شدید ہو گئی

> ہے کہ منزل تک جلد پہنچنے کی عجلت میں ہوش و حواس ہی بجا نہیں رہتے۔ طمانیت کی جگہ طمع نے لے لی تھی۔ آج کا نوجوان اگر کاروبار میں داخل ہوتا ہے تو سال دو سال کے اندر ہی لکھ پتی بن جانا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور نہیں ہونے پر وہ ایسا فرسٹیڈ ہوتا ہے کہ سماج کے لیے ایک نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ یہ مریض اپنے ماضی سے متنفر حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس بنا کر 'ہپّی' مزاج بنا دیتا ہے۔ ادب میں بھی آج اسی عجلت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ قلم ہاتھ میں لیا اور کرشن چندر، جمیل مظہری، بیدی، اختر الایمان، فیض، رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور منٹو بن جانے کی عجلت میں مضحکہ خیز باتیں کر کے عجیب اور اہم بننے کی سعی کرنے لگے۔ چونکا دینے والی بات، کچھ حیران کرنے والی بات، بالکل اس طور پر جیسے چورستوں (چوراہوں) پر دوا بیچنے والے کرتے ہیں۔ اختراع، تخلیق، دریافت اور اقدار کی تخلیق سچے فنکار کے لیے ضروری ہے لیکن عجلت ان سب کی دشمن ہے۔ دو برسوں، چار برسوں میں کرشن چندر، بیدی اور منٹو بن کر کوئی نہیں دکھا سکا ہے لیکن شاعری اور افسانوں میں محنت اور ریاضت سے جان چرانے اور مطالعے کے فقدان کے مظاہرے روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں۔''

کلامِ حیدری ۲۲ برسوں تک بودھ کی دھرتی گیا سے اردو کا ادبی ماہنامہ 'آہنگ' اپنے ذوق وشوق اور ذاتی خرچ سے شائع کرتے رہے۔ ان کا انتقال ۲ فروری ۱۹۹۴ء کو ہوا۔ وہ آخری عمر میں دل کے مریض ہو گئے تھے، آپریشن بھی ہوا تھا۔ کاروباری مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ اسی لیے عمر کے آخری حصے میں وہ 'مورچہ' اور 'آہنگ' شائع نہیں کرا سکے۔ اس رسالے کو جاری رکھنا ان کا خواب تھا۔ ان کے انتقال کے چند برسوں بعد پروفیسر افصح ظفر کی ادارت میں 'آہنگ' کے دو شمارے نکلے۔ افصح ظفر صاحب کے معاون

ہمایوں رشید، ڈاکٹر محفوظ الحسن اور ڈاکٹر مظہر حسین تھے مگر یہ افراد ادبی رسالہ نکالنے کی ہمت نہیں جٹا سکے اور 'آہنگ' اپنے سینے کے اندر بے پناہ خزانہ اور ادبی سرمایہ سموئے ہوئے لائبریریوں کی زینت بن کر رہ گیا۔ 'مورچہ' اور 'آہنگ' نے اپنے عہد کے نوجوانوں اور قلمکاروں کے ذہنوں کو شدید طور پر متاثر کیا۔ غیر جانبداری اور واضح نقطۂ نظر کو پیش کرنے کا اصول اپنایا۔ ادبی خدمت کی اس جیسی مثالیں خال خال ہی ملیں گی۔ 'آہنگ' کوئی سرکاری رسالہ نہیں تھا۔ 'مورچہ' بھی کلام حیدری کے دم سے ہی تھا۔ اردو صحافت کی تاریخ میں 'مورچہ' اور 'آہنگ' کی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے مدیر کلام حیدری کے ادبی جنون نے جو کارنامہ انجام دیا وہ ماضی کا یادگار حصہ ہے۔ کلام حیدری کی عظمت کا اعتراف شمس الرحمٰن فاروقی نے ان جملوں میں کیا ہے:

> ''وہ بڑے اڈیٹر ضرور تھے اور اچھے لکھنے والوں کو جمع کرنے کا ڈھنگ جانتے تھے۔ ہفتہ وار 'مورچہ' ہو یا ماہنامہ 'آہنگ' وہ اپنے رسالے کو متحرک، تازہ مسائل سے دست و گریباں اور خیال انگیز بنائے رکھتے تھے۔ افسوس کہ بیماری نے انھیں بہت جلد بوڑھا کر دیا اور زندگی کے آخری برس انھوں نے تعطل میں گزارے ورنہ جب تک کلام حیدری فعال تھے ان سے ہمیشہ کسی نہ کسی کارنامے کی توقع رہتی تھی۔ ان کی جوئے حیات میں پانی اب نہ رہا لیکن ان کے کارناموں سے گوہر شب چراغ کی طرح باقی ہیں۔''
>
> (ماہنامہ 'سہیل'، گیا، کلام حیدری، صفحہ نمبر ۸۱)

ادبی صحافت سے وابستہ توقعات، کلام حیدری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی کے مندرجہ بالا جملے اور کلام حیدری کے اداریے اگر ایک دوسرے کے متوازی رکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان کی صحافتی خدمات کے بارے میں میں نے جو بھی رائے قائم کی ہے وہ محض عقیدت یا محبت کا شاخسانہ نہیں ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کلام حیدری ہمارے ہونہار صحافیوں میں سے ایک ہیں۔ افسوس کہ زندگی نے انھیں زیادہ مہلت نہ دی جس کی وجہ سے اس تعلق سے ان کا سرمایہ یقیناً قلیل ہے۔ اس قلیل سرمایے سے بھی اتنا ضرور

واضح ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک افسانہ نگار اور ناقد تھے بلکہ ان میں صحافت کے جوہر بھی خوب کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ وہ صحافت کو زندہ اور فعال رکھنے کے ہنر سے بخوبی واقف تھے۔ ان کا یہ ہنر کسی منفی رجحان کا زائیدہ نہیں تھا کہ جس میں آج کل کی طرح ہلچل اور ہنگامہ خیزی کے مقصد سے زرد صحافت سے بھی گھٹیا ہتھکنڈے اپنائے جائیں۔ صحافت کے تعلق سے کلام حیدری کا اپنا نقطۂ نظر تھا اور اس کی پیش کش میں وہ ہمیشہ ایماندار رہے۔ اپنی فکری اور نظریاتی وابستگی کی نمائندگی اور اس کے اظہار میں کلام حیدری کو کوئی باک نہیں تھا، وہ کبھی کسی سے خوف زدہ نہیں ہوئے۔ ان سے نظریاتی اختلاف ہوسکتا ہے، ان کے تجزیوں سے اتفاق نہ کیا جاسکے، یہ بھی ممکن ہے لیکن ایک صحافی کی حیثیت سے ان کی صلاحیت، لیاقت اور ایمانداری کا اقرار کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔

کلام حیدری کی تنقید نگاری

ادبی دنیا میں کلام حیدری ایک معروف افسانہ نگار اور کہنہ مشق صحافی کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے باقاعدہ تنقید کی طرف توجہ نہیں کی۔ ان کے تنقیدی مضامین کا صرف ایک مجموعہ ''تفہیمات'' مارچ ۱۹۸۳ میں دی کلچرل اکیڈمی، جگ جیون روڈ، گیا سے شائع ہوا، جس میں ''جوش کی انقلابی شاعری''، ''ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت''، ''جب کھیت جاگے''، ''منٹو''، ''تخلیقی عمل: ایک جائزہ''، ''تصورات عشق وخرد: اقبال کی نظر میں''، ''حسرت اور صحافت'' کے علاوہ ''پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے'' شامل ہیں۔ گویا یہ کہ کل آٹھ تنقیدی مضامین ان کا تنقیدی سرمایہ ہیں۔ ان کے علاوہ چند مضامین ممکن ہے اخبار ورسائل میں شائع ہوئے ہوں۔ اس تنقیدی مضامین کے مجموعے کے علاوہ ان کے ادبی تبصروں کا مجموعہ 'برملا' اور ان کے منتخب اداریوں کا مجموعہ 'مزامیر' بھی شائع ہوا جن سے ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کلام حیدری کے تبصروں اور اداریوں کی اپنے زمانے میں بڑی دھوم تھی اور انھیں غیر معمولی مقبولیت وشہرت حاصل تھی۔ کلام حیدری کے ہفتہ وار 'مورچہ' کے منتخب اداریے ''فراز دار'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئے، جس میں زبان، ادب، تعلیم اور سیاست کے موضوعات پر ان کی تحریریں شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ کلام حیدری نے ''ارتقا'' سیریز کے تحت ۱۹۷۶ سے ۱۹۸۰ تک اردو کے اہم افسانوں کا انتخاب شائع کیا اور ''ادب اور تصوف'' کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی۔ کلام حیدری کی ان تنقیدی نگارشات کی روشنی میں انھیں بحیثیت نقاد جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ کلام حیدری کو یہ احساس تھا کہ وہ ایک نقاد نہیں ہیں۔ ان کے عہد میں کلیم الدین احمد، احتشام حسین، آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا وغیرہ ناقدین کا خاصا چرچا تھا۔ ان کی اور دیگر ناقدین و تخلیقی

فنکاروں کی تحریریں کلام حیدری کی نظروں میں تھیں۔ کلام حیدری نے تنقید کے لیے کسی بُت کی پیروی کرنا مناسب نہیں سمجھا بلکہ وہ ایک بُت شکن نقاد رہے۔ اپنے مطالعے، فکر، سوچ اور زاویۂ نظر پر انھیں زبردست اعتماد تھا۔ وہ کسی بھی بڑے سے بڑے فن کار یا نقاد کے پیروکار اور ان سے شدید طور پر متاثر ہونے والے نہیں رہے۔ ادب کے تعلق سے ان کا اپنا ایک واضح نظریہ اور کمٹمنٹ تھا۔ ادب کا مطالعہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنی ذہانت وذکاوت کی وجہ سے وہ تخلیق وتنقید کی تہہ تک فوراً پہنچ جاتے اور ان تحریروں کی خوبیاں وخامیاں ان پر عیاں ہوجاتیں۔ اپنی تنقید نگاری کے بارے میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

> ''تنقید میرا میدان نہیں مگر تنقیدوں کو پڑھ کر متاثر ہونا یا نہ ہونا میرا حق ضرور ہے۔ تاثرات کو کبھی کبھار لکھ دینا میری مجبوری ہے۔ کیوں کہ تاثرات شدید ہوتے ہیں اور میری خواہش ہوتی ہے کہ میرے تاثرات دوسروں تک پہنچیں۔ اگر تنقید سے مجھے ادب کے دامن میں آگ لگنے کا خطرہ محسوس ہوتا ہے، تو میں بے قرار ہوکر ادب تخلیق کرنے والوں کو پکار کر کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس آگ سے ادب کا دامن بچاؤ ورنہ تخلیق مرجائے گی ——— ظاہر ہے اس بات میں ایک خطرہ بھی ہے کہ میرے تاثرات کسی کو پسند نہ آئیں ——— خصوصاً ادب کی تخلیق کو فلیتہ لگانے والے نقادوں کو جو جملہ بازی کرکے تنقید کا بدل سمجھ کر میرے تاثرات پر چسپاں کرکے دل ہی دل میں خوش ہولیتے ہیں ——— مگر ادبی دنیا میں ان کو داد نہیں ملتی۔

(تصوراتِ عشق وخرد: اقبال کی نظر میں، تفہیمات، ص۹۲۔۹۳)

کلام حیدری اپنی تنقید کے تعلق سے ''تفہیمات'' کے ابتدائی صفحات میں یہ بھی لکھتے ہیں:

> ''میں نے شروع سے ہی اپنی الگ راہ بنائی وہ چاہے پگڈنڈی ہی کیوں نہ ہو۔ میں شاہراہ بنانے کی اہلیت رکھتا ہوں کہ نہیں، یہ فیصلہ

> کرنا مستقبل کا، اور دوسروں کا کام ہے۔ میں اپنے اندازِ نظر اور طریقۂ فکر کو تجسس اور تشکیک آمیز پاتا ہوں، تقلید کرنے اور مرعوب ہونے کو ہمیشہ کفر جانا، عالم کا احترام کرنا، علم کی قدر کرنا اور صاحب نظر سے متاثر ہونا میرا مزاج ہے۔
>
> میری تنقیدی روش کے سفر کا مطالعہ میرے لیے دلچسپ ہے۔ اپنی عدیم الفرصتی کو روتا ہوں کہ اب تک یک موضوعی تنقیدی کتاب اردو کو نہیں دے سکا۔ حالانکہ موضوعات نے روح اور ذہن کو بے چین کر رکھا ہے۔''

(چند باتیں، تفہیمات، ص:۸-۷)

کلام حیدری کے درج بالا ان دونوں اقتباسات سے ان کے ذہنی رویے اور روش کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا ''میں تنقید کو ادب کے پیچھے لاٹھی لے کر پھرنے والا سمجھتا ہوں''۔ یہ پورا رویّہ کلام حیدری کا حد درجہ بے باکانہ اور خود اعتمادی سے بھرا ہوا ہے۔ جس کا اندازہ ان کے تنقیدی مضامین کے مطالعے سے بھی ہوتا ہے۔

اپنے مضمون ''جوش کی انقلابی شاعری'' میں کلام حیدری، جوش ملیح آبادی کے تصورات اور ان کی شاعری سے شدید اختلاف رکھتے ہیں۔ کلام حیدری کے خیال میں جوش کے انقلاب کا تصور محدود اور زیادہ تر رومانی ہے۔ اردو میں جوش ہی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مذہب، سماج، محکومی اور خدا کے خلاف نعرۂ بغاوت بلند کیا۔ کلام حیدری نے جوش کی پوری شاعری کا جائزہ پیش کیا اور اس کا خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ اگر خطابت کا نام شاعری ہے تو کسی کو جوش کی شاعری میں شبہ نہیں ہونا چاہیے۔ جوش کی شاعرانہ عظمت کا ایک زمانہ قائل ہے لیکن ان کی خطابت اور ان کے پرشکوہ الفاظ اکثر ان کی ناکامی بن جاتے ہیں۔ کلام حیدری کو اس کا شدید احساس ہے اسی لیے وہ لکھتے ہیں ''جھنجھلاہٹ اور غصہ نے مل ملا کر جوش کی شاعری کو خطیبانہ رنگ میں اس حد تک غرق کردیا ہے کہ شعریت مردہ ہوگئی ہے، وہ بیان و انداز بیان انقلاب وشعر میں خوشگوار توازن قائم نہیں کرسکے۔ وہ واعظ ہیں، باغی ہیں، مگر شاعر نہیں۔'' اصل بات تو یہ ہے کہ کلام

حیدری جوش کے باغیانہ تیور اور مزاج، روش اور بغاوت سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ انھیں جوش کے باغیانہ تصور میں ایک قسم کی سطحیت نظر آتی ہے اور وہ اسے نری جذباتیت سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جوش کے کلام میں گہرائی و گیرائی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کے کلام میں سنجیدگی کے بجائے پھکڑ پن در آیا ہے۔ کلام حیدری کے مطابق جوش اپنی ان کمیوں کو شوکت الفاظ کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ کلام حیدری کا خیال ہے کہ جوش کی شاعری میں یہ سطحیت اور نری جذباتیت کا سبب مطالعے کی کمی اور سماجی علوم سے ناواقفیت ہے۔ اس سلسلے میں کلام حیدری نے بڑے معرکے کی بات کہی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ’’وہ سرمایہ دار کو پرشکوہ الفاظ میں گالیاں اور کوسنے دے سکتے ہیں مگر اس کی کوئی وجہ بیان نہیں کر سکتے۔ وہ حسن کو کنکر کوٹنے پر مجبور دیکھ کر ایک خالص جذباتی نظم کہہ سکتے ہیں مگر اس کا تجزیہ نہیں کر سکتے.. .وہ اس کا کنکر کوٹنا گوارا نہیں کر سکتے محض اس لیے کہ وہ حسین ہے اور جوان۔ لیکن چھوٹا ناگ پور کی سیاہ فام جھریاں پڑی بڑھیا کو مٹی ڈھوتے ہوئے دیکھ کر ان میں کوئی تحریک پیدا نہیں ہوتی۔‘‘
>
> (جوش کی انقلابی شاعری: تفہیمات، ص:۱۳۰)

مندرجہ بالا اقتباس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا تعلق جوش کی سماجی علوم کی ناواقفیت سے ہے۔ دوسرے حصے کا تعلق جوش کی روش یا سروکار سے ہے۔ یہ اقتباس کلام حیدری کی بے لاگ اور دوٹوک تنقید کا مظہر ہے۔ اگر جوش کی انقلابی شاعری کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو یہی بات ثابت ہوگی جو کلام حیدری نے لکھی ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری کا عام رویہ یہی ہے۔ لہٰذا کلام حیدری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جوش کے یہاں انقلاب کا تصور حقیقتاً رومانی ہے، یہ وہ انقلاب ہرگز نہیں جس کی جڑیں سماجی حقیقت نگاری کی فکر سے وابستہ ہوں۔ اس مضمون میں کلام حیدری نے جوش کی انقلابی شاعری، رومانی شاعری، سیاسی شاعری اور نیچرل شاعری الغرض ہر اس زاویے سے جائزہ لیا ہے جو جوش کی عظمت کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ کلام حیدری نے بڑے مدلل انداز میں مثالوں کے ذریعے سے ہر میدان میں جوش کی ناکامی کو واضح کیا ہے۔ کلام حیدری نے جوش کی تنقید کرتے وقت ان کے کلام سے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں قابل غور بات یہ بھی ہے

کہ کلام حیدری نے ان نظموں سے مثالیں نہیں پیش کیں جو عام طور پر زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔

’’ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت‘‘ کلام حیدری کا یہ مضمون ۱۹۵۶ء میں رسالہ ’پگڈنڈی‘ کے غزل نمبر میں شائع ہوا۔ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ولی ہمارے ادبی ورثے کا ایسا شاعر ہے جس نے نہ صرف اپنے پیش رووں کے شعری تجربات کو اپنی شاعری میں نچوڑ کر رکھ دیا بلکہ اپنے بعد آنے والے شعرا کے لیے نئے امکان بھی پیدا کیے۔ ولی کی اہمیت ہماری شعری و ادبی روایت میں محض تاریخی نہیں بلکہ وہ اس راہ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بات اپنے آپ میں تعجب خیز ہے کہ کلام حیدری جیسے ذہین اور صاحب بصیرت ناقد نے میر، غالب یا اقبال میں سے کسی پر اپنے قلم کو جنبش نہیں دی۔ یعنی کوئی مربوط اور باقاعدہ مضمون نہیں لکھا۔ یہی حال افسانوی ادب کا بھی ہے۔ وہاں سے بھی کلام حیدری نے صرف پریم چند کو اپنی گفتگو کے لیے منتخب کیا (منٹو اور کرشن چندر پر ان کی گفتگو کا دائرہ مخصوص نوعیت کا ہے)۔ تو کیا ولی اور پریم چند کے مابین کوئی قدر مشترک ہے۔ میرا خیال ہے وہ قدر مشترک یہی ہے کہ جس طرح آدمی، آدمؑ سے اپنی مشابہت کا انکار نہیں کر سکتا اسی طرح غزل گو، ولی سے اور فکشن نویس، پریم چند سے اپنی مشابہت کا انکار نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں ولی کو پریم چند پر بعض حیثیتوں سے فوقیت حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہاں بھی یعنی ولی میں کلام حیدری کی دلچسپی PRIMITIVE SENSIBLITY کی وجہ سے ہے۔ بہر حال کلام حیدری اس مضمون کا آغاز حسب ذیل کرتے ہیں:

> ’’یہ خیال اب اختلافی مسئلہ نہیں رہا کہ کسی شاعر کا مطالعہ بالکل الگ کر کے صحیح نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا، بلکہ اس کی شاعری کو اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ سماجی، سیاسی اور دوسری حالتوں کے پیش نظر ہی اس کی شاعری کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور اس کا درجہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ شاعر کے مطالعہ سے قبل اس بات کی ضرورت ہے کہ اس دور کا مطالعہ کیا جائے۔ یہی طریقۂ فکر زیادہ سائنسی و عقلی ہے۔ اس سے ٹھوس اور قابل اعتماد نتائج نکلتے ہیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ شاعر نہ تو خلا میں جنم لیتا ہے اور نہ اپنے ماحول سے بالکل

آزاد ہوتا ہے۔ وہ جن خیالات کو پیش کرتا ہے ان پر بھی اپنے زمانہ کی چھاپ ہوتی ہے اور جو طریقۂ اظہار، اسلوب اور زبان استعمال کرتا ہے ان پر بھی خاص دور کی مہر ہوتی ہے۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت: تفہیمات، ص:۲۹)

مجھے اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ کلام حیدری جیسا زیرک اور صاحب بصیرت قلم کار ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہے جو فن کار کو اپاہج قرار دیتی ہے۔ بات کہنے تک تو ٹھیک تھی لیکن جب شاعری کو سمجھنے کے لیے سماجی، سیاسی اور دوسری حالتوں پر اصرار اور تاکید بڑھ جائے تو یقیناً یہ فن کار کے ساتھ ظلم ہے۔ اگر کسی شاعر یا ادیب کی سماجی، سیاسی وغیرہ حالتوں کا علم نہ ہو تو کیا اس کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اس عہد کی سیاست کا مطالعہ کرنا ضروری ہے؟ فرض کیجیے یہ بھی نہ ملے، ہمیں بس شاعر کا تخلیقی متن دستیاب ہے۔ تو کیا اس تخلیقی متن کی تفہیم اور تجزیہ کار لایعنی ٹھہرے گا یا اس تخلیقی متن کی روشنی میں خالق کی تعیین قدر ناممکن ہے؟ میرے سامنے ایک سوال آ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ شاعری یا ادب کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے سیاسی اور سماجی حالتوں کا علم ضروری ہے، یا متعلقہ ادبی و لسانی معاشرے کی رسومیات اور تصورات شعر و ادب کا جاننا اور اس کا درک ضروری ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی زبان اور فن میں بعض قدیم روایات اور لفظیات کی موجودگی سے کسی قسم کا اندیشہ لاحق ہوا ہوگا۔ اسی لیے قدیم عناصر کو جواز بخشنے والی ایسی تمہید کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ولی کی غزلوں پر گفتگو کرنے سے پہلے کلام حیدری اردو زبان و ادب کے ارتقا کو نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو تین دھاروں سے سیراب ہوئی ہے۔ اس میں تین دھارے مختلف اوقات میں آ کر ملے ہیں اور انھوں نے اس پر اپنے اثرات چھوڑے ہیں ان اثرات کی تلاش بڑا دلچسپ کام ہے اور ساتھ ساتھ ضروری بھی کہ اس سے ہمیں اپنی زبان کے مزاج اور کردار کو سمجھنے میں آسانیاں ہوتی ہیں۔ اردو کے اولین دور میں سنسکرت اور

بھاشا کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہی اردو کی بنیاد ہے اور یہی چیز اسے بنیادی طور پر ہندوستانی بناتی ہیں۔ دوسری دھارا جو اس سے ملی وہ عربی اور فارسی ہے۔ تیسری دھارا انگریزی ہے۔ ابتدا میں بھاشا کا اثر زیادہ ہے، درمیان میں عربی اور فارسی کا اثر بڑھ گیا۔ عہد جدید میں رد عمل ہوا اور ہم بھاشا کی جانب پلٹے۔ حفیظ اور دوسرے شاعروں نے گیت لکھے، فارم ہندوستانی ہے۔ اور زبان بھی بھاشا سے قریب تر ہے۔ لیکن عہد جدید میں انگریزی کے توسط سے نئے فارم بھی آئے ہیں اور اس ردعمل سے زبان فارسی اور عربی سے کچھ آزاد بھی ہوئی ہے۔ فارم کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظم معرا، سائنٹ اور بندوں (STANZA) کی تقسیم ہے یہ سب انگریزی اثرات ہیں۔ فارم کا جتنا تنوع دور جدید میں پیدا ہوا ہے وہ سب مغرب سے آیا ہے۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت: تفہیمات، ص:۳۰ تا ۳۱)

ظاہر ہے کلام ولی پر گفتگو کرنے کے لیے پہلی دو دھارائیں ہی کار آمد ہیں اور اس تعلق سے کلام حیدری نے بالکل درست لکھا ہے کہ:

''ولی اس دور کے بعد آئے ہیں جب بھاشا کا اثر ہماری زبان پر بہت زیادہ تھا۔ تاہم ان کے یہاں بھی یہ اثرات کافی نمایاں ہیں جو انھیں ادبی وراثت میں ملے تھے۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت: تفہیمات، ص:۳۲)

ارتقا کے اعتبار سے یہ بات بالکل درست ہے کہ ولی کے عہد تک آتے آتے اردو زبان بڑی حد تک فارسیت کی طرف مائل ہوگئی تھی۔ اردو کا یہ میلان لسانی سطح پر بھی تھا، ادبی موضوعات کی سطح پر بھی تھا اور ہیئت کے معاملے میں بھی تھا۔ لیکن اس وقت بات الجھ جاتی ہے جب کلام حیدری یہ لکھتے ہیں کہ:

بھاشا کے یہ اثرات ولی کی ان غزلوں پر زیادہ اور نمایاں ہیں جو

انھوں نے شمالی ہند سے تعلقات سے قبل لکھی ہے۔ دکن میں جو زبان بہمنی
تاجداروں کے زیرِ سایہ پرورش پا رہی تھی وہ شمالی ہند کے مقابلے میں،
اپنے مزاج کے اعتبار سے زیادہ ہندوستانی تھی۔ اس میں فارسی اور عربی
کے اثرات کم تھے۔ دونوں جگہوں کی اردو زبان میں نمایاں فرق ہے۔
بہمنی مغل دربار سے زیادہ ہندوستانی تھی۔ یہی فرق دونوں جگہ
کی اردو زبان میں بھی تھا۔ یہ فرق اسی وقت کم ہوا اور آہستہ آہستہ
تقریباً ختم ہو گیا۔ جب بہمنی سلطنت زوال پذیر ہوئی اور دہلی کا سکہ
دکن میں بھی چلنے لگا۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت، تفہیمات، ص:۳۲)

مجھے نہیں معلوم کہ ولی کی کن کن غزلوں کو تاریخی اعتبار سے ولی کے ورودِ دہلی سے قبل کی نشان زد کیا گیا ہے۔ یا اس باب میں کوئی ایسا کلیہ بنا لیا گیا ہے جس کی رو سے ولی کی وہ غزلیں یا اشعار دہلی کے تعلق میں آنے سے پہلے کے تسلیم کر لیے گئے جن پر بھاشا یا ہندوستانی اثرات زیادہ ہیں۔ یہاں ایک سوال اور ذہن میں پیدا ہوتا کہ فارسی اثرات کو ہندوستانی اثرات، کم از کم لسانی سطح پر کیوں نہیں کہہ سکتے؟ جب کہ امیر خسرو کا عالم تو یہ ہے کہ وہ ہندوستانی فارسی یا دہلی کی فارسی کے آگے اصفہان وخراسان کی فارسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اور غیر مستند سمجھتے ہیں۔ اس سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ فارسی بھی دیگر ہندوستانی زبانوں کی طرح ایک ہندوستانی زبان، کم از کم خسرو کے عہد میں ضرور تھی اور اس فارسی میں ایک قسم کا ہندوستانی پن ضرور تھا۔ اور اس زبان پر ہندوستان کا دعویٰ بھی تھا۔ بھلا عہد بہمنی میں شمال اور دکن کی اردو میں فرق جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ بہمنی سلطنت کے زوال سے دہلی کا سکہ دکن میں ان معنوں میں نہیں چلا کہ کسی قسم کے دوررس اثرات مرتب ہوں۔ بہمنیوں کی بساط پر اپنا وجود قائم کرنے والی قطب شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں بھی ابتدا میں اتنی ہی مستحکم تھیں جتنا کہ بہمنی۔ اور پھر خود دکن میں قطب شاہیوں اور عادل شاہیوں کی زبان یا میلانات میں خاصا فرق ہے۔ ظاہر ہے یہ فرق جغرافیائی حدود میں عہد بہمنی میں بھی رہا ہوگا جو کہ قطب شاہی اور عادل شاہی علاقوں میں تھا۔ غالباً یہ فیصلہ بہمنی عہد کی تخلیق ''کدم راؤ پدم راؤ'' کو

نظر میں رکھتے ہوئے کیا گیا ہے۔ کلام حیدری کی تمہیدی گفتگو سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ادبی اور لسانی ارتقا کے مراحل پر ان کی نظر ہے لیکن نتائج اخذ کرنے میں عجلت سے کام لیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پہلے کوئی نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اور پھر اس فریم میں تاریخی مواد کو فٹ کر دیا گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کلام حیدری یہ نہ لکھتے:

''وجہی کی زبان میں عربی اور فارسی کے الفاظ سے احتراز ہے،
ہندی ہی طرز ادا ہے۔ سارے خیالات ایسی خوبی سے ادا کیے گئے ہیں
اور ان میں مقامی رنگ اتنا عمدہ ہے کہ میں کبھی کبھی یہ سوچنے لگتا ہوں
کہ اگر اردو اسی رفتار پر آگے بڑھتی تو یہی ہندوستان کی مشترکہ زبان
بن سکتی تھی۔ تشبیہ اور استعارے بھی مقامی رنگ لیے ہوئے ہیں۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت: تفہیمات، ص:۳۳)

حالانکہ ارتقائی مراحل کو مدنظر رکھا جائے تو وجہی اس روایت کا امین ہے جو فارسیت کی طرف مائل ہے۔ اپنے پیش رووں کے مقابل وجہی کے یہاں فارسی اثرات نہ صرف زیادہ بلکہ نمایاں ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ کلام حیدری نے وجہی کی زبان کا تجزیہ کرتے وقت سودا، ناسخ یا غالب کی زبان کو پیش نظر رکھا ہے۔ اپنے ارتقائی سفر میں اردو کا ہندوستانی تشبیہوں اور استعاروں سے ہاتھ دھولینا بھی کسی مفروضے سے کم نہیں۔ اگر اکا دکا شاعروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہندوستانی تشبیہیں اور استعارے بیشتر شعرا کے یہاں مل جائیں گے اور وافر مقدار میں ملیں گے۔

کلام حیدری کہتے ہیں کہ ولی کا معشوق ایران کا پری زاد نہیں ہے، وہ بالکل ہندوستانی ہے۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ان کی غزلوں کا عاشق ''چشم مخمور'' سے شراب کے بجائے ''نینوں'' سے مے ارغوانی طلب کرتا ہے۔ یہاں دو باتیں ہیں۔ پہلی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس نے کلام ولی کا مطالعہ کرنے کے بجائے مخصوص زاویۂ نظر سے منتخب کیے گئے کلام ولی کا انتخاب پڑھا ہو۔ معلوم نہیں کیوں کلام حیدری جیسے کثرت مطالعہ کے عادی شخص کو یہ تسامح ہوا۔ دوسری بات میں قابل غور پہلو یہ ہے کہ معشوق کی آنکھوں سے شراب یا مدرا طلب کرنے کا تصور ہندوستانی ہے یا فارسی یا دونوں میں قدر مشترک۔ تشبیہ و استعارے

کے تعلق سے کلام حیدری لکھتے ہیں:

''میں نے کہیں اوپر یہ بات کہی ہے کہ ولی کی غزلوں میں صرف الفاظ ہی تک ہندی اثرات محدود نہیں ہیں بلکہ تشبیہات میں بھی ہندوستانی پن ہے۔ ولی کا ایک شعر سنیے ؎

ترے غم میں دل سوراخ سوراخ
کیا پیدا صدائے بانسلی کو

بانسلی کا ایسا استعمال کوئی کرشن کے دیس کا باسی ہی کر سکتا ہے۔''

(ولی کی غزلوں کی ایک خصوصیت: تفہیمات، ص: ۳۷)

نفس مضمون کے اعتبار سے تو بانسری کا ایسا استعمال رومی کے دیش کا باسی یا رومی کی روایت کا امین ہی کر سکتا ہے۔ کرشن سے مناسبت تو صرف بانسری کے استعمال تک ہے مگر مضمون جس نوع کا ہے اسے رومی کی 'نے' سے زیادہ تعلق ہے۔ الغرض اس مضمون میں کلام حیدری کے قلم سے ایسی کوئی بات نہیں نکلی جو ولی کی غزل گوئی کو منفرد مقام عطا کرتی ہو یا اس کے کسی اچھوتے، نادر یا اولیت کے حامل پہلو کی نشان دہی کرتی ہو۔ ولی کی غزلوں میں ہندی یا بھاشا کے الفاظ ولی سے پہلے زیادہ تھے اور ولی کے بعد شمالی ہند میں بھی اس کا تناسب کم نہیں۔ کم از کم عہد سودا اور میر سے پیوستہ عہد تک۔ بالخصوص معشوق کے لیے سجن، پیارے اور سانولے وغیرہ لفظوں کا استعمال تو خوب ہوا ہے۔ حتیٰ کہ عاشق اور معشوق کے صنف کی شناخت اور عورت بطور عاشق بھی پائی جاتی ہے۔ جیسے ولی تک آتے آتے یہ اثرات کم ہو رہے تھے ویسے ہی ولی کے بعد رفتہ رفتہ معدوم ہوتے گئے۔

''جب کھیت جاگے: ایک جائزہ'' کرشن چندر کی ناول نگاری بالخصوص ان کے ناول ''جب کھیت جاگے'' کے تعلق سے ایک اہم مضمون ہے۔ یہ مضمون سالنامہ ''راہی''، ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ کرشن چندر کی ناول نگاری کے تعلق سے بعض بے باکانہ رائے کے اظہار کے علاوہ یہ مضمون کلام حیدری کی ژرف نگاہی، باریک بینی اور لفظوں کے استعمال کے پس پردہ چھپے مقاصد کو محسوس کرنے کی صلاحیت پر دال ہے۔ مثال کے طور پر یہاں دو اقتباس پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ پہلا اقتباس وامق جونپوری کا ہے اور

دوسرا سردار جعفری کا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اس دور کا کارنامہ باوجود اپنی جغرافیائی خامیوں کے کرشن کا کھیت جاگ اٹھے ہے۔''

(جب کھیت جاگے ایک جائزہ، تفہیمات، ص: ۴۰)

''اس میں نہ تو اس قسم کا پلاٹ ہے۔ جسے ادب کے کٹھ ملاؤں نے چوکھٹے کی طرح بنا کر رکھ دیا ہے۔''

(جب کھیت جاگے ایک جائزہ: تفہیمات، ص: ۴۲)

وامق جونپوری کے اقتباس کے تعلق سے کلام حیدری کا کہنا ہے کہ وامق نے کرشن چندر کے زیر بحث ناول میں ''جغرافیائی خامیوں'' کا اعتراف کیا ہے لیکن ''باوجود'' لگا کر اس خامی کو کافی کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ یہ جغرافیائی خامی کوئی معمولی غلطی نہیں ہے۔ یہ غلطی اس لیے بھی معمولی نہیں ہے کیونکہ کرشن چندر نے ایسی غلطی پہلی بار نہیں کی، بلکہ وہ اکثر ایسی غلطیوں کو دوہراتے ہیں۔ کلام حیدری نے ایسی جغرافیائی غلطیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ مثلاً دکن کی پلیٹو پر روئی کے پھول اگانا، گنگا اور جمنا کے سنگم پر اپنے تخیل سے پل بنا دینا اور یہ تاثر دینا گویا یہ کوئی جغرافیائی وجود رکھتا ہو، تلنگانہ میں لسی کا ذکر اس انداز سے کرنا کہ تلنگانہ بھی پنجاب معلوم ہونے لگے، مغرب سے مشرق کی طرف سفر کرتے ہوئے الہ آباد سے پہلے جمشید پور کا ریلوے اسٹیشن قائم کرنا وغیرہ۔ اس طرح کلام حیدری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ وہ جغرافیائی غلطیاں ہیں جن کو وامق معمولی سمجھتے ہیں اور ان ہی غلطیوں کو تخیل کی اڑان سمجھا جاتا ہے۔ وامق نے کم از کم اس کا اعتراف تو کیا جبکہ سردار جعفری اعتراف تو کجا لائق اعتنا بھی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ کلام حیدری کے نزدیک ان جغرافیائی غلطیوں کا احساس سردار جعفری کو بھی ہے۔ لہٰذا اس بے راہ روی کی مدافعت کرتے ہوئے سردار جعفری نے ''ادب کے کٹھ ملاؤں'' کہہ کر نقادوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلام حیدری کا موقف یہ ہے کہ اس قسم کی غلطیاں کرشن چندر کے یہاں ہوں تو یہ اور بھی سنجیدہ ہو جاتی ہیں کیونکہ کرشن چندر کوئی مبتدی نہیں ہیں۔ کلام حیدری کرشن چندر کے اس ناول کو اردو ناول نگاری میں کوئی اہم اضافہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ اپنے موضوع کو فنکارانہ طور پر یا فنی تقاضوں کے تحت نہیں برت سکے۔ کلام

حیدری کو اس بات کا اعتراف ہے کہ ''جب کھیت جاگے'' میں نہ تو کرشن چندر کا موضوع کمزور ہے اور نہ ہی موضوع کے تعلق سے ان کے خلوص میں کمی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ناول فنی اعتبار سے کمزور ہے تو اس کی وجہ کرشن چندر کی جذباتیت اور عجلت پسندی ہے۔ موضوع کے تعلق سے کرشن چندر کے یہاں جو خلوص ہے اس کی بنا پر کلام حیدری ان کو ایک فرض شناس فن کار کہتے ہیں اور یہ مانتے ہیں کہ اس تعلق سے کرشن چندر کے پایے کا کوئی ادیب اردو میں نہیں۔ لیکن یہی فرض شناسی کرشن چندر کو فن سے بے گانہ کر دیتی ہے اور بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ محض فرض پورا کرنے کے لیے لکھ رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں فن کا کمزور پڑ جانا فطری ہے اور اس کمی کو کرشن چندر اپنے حسنِ اسلوب میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کرشن چندر کی اس روش کے بارے میں کلام حیدری کے الفاظ ملاحظہ کیجیے:

> ''اس ''فرض شناسی'' کی وجہ سے وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ہونے والے ہر اہم واقعہ، تحریک اور تنظیم کے بارے میں لکھیں۔ اپنے حدود سے باہر قدم نکالتے ہوئے وہ یہ نہیں سوچتے کہ جس ماحول اور کردار کو وہ پیش کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے ہیں یا نہیں جن کو انھوں نے قریب سے دیکھا ہو، اچھی طرح جانتے ہوں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے وہ اپنے وجود کو پورے ماحول اور کرداروں پر مسلط کر دیتے ہیں۔ براہ راست تقریروں، بیانوں، جذباتی مکالموں کے ذریعہ حقیقت نگاری کا خون ہو جاتا ہے۔ ان کے بعض کردار ایسی زبان بولنے لگتے ہیں جو وہ شاید سمجھ بھی نہ سکیں اور یہاں پر ان کا اپنا سیاسی اور سماجی شعور چھا جاتا ہے، جس سے مصنف کی نیت، اس کا مقصد عریاں طور پر سامنے آجاتا ہے۔ حالانکہ مصنف کا مقصد جتنا زیادہ چھپا ہوا ہوگا اتنا ہی مقصد پورا ہوگا۔''
>
> (جب کھیت جاگے ایک جائزہ: تفہیمات، ص:۵۳)

اس مضمون سے جہاں کرشن چندر کی ناول نگاری کے تعلق سے کلام حیدری کی بے باکانہ رائے

سامنے آتی ہے وہیں فن ناول نگاری کے تعلق سے خود کلام حیدری کے نظریات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس مضمون کی قرات سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام حیدری مواد کے ساتھ ساتھ ہیئت کو بھی یکساں طور پر اہم جانتے تھے۔ یہاں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کلام حیدری ترقی پسندوں کے اس مشہور نظریے سے شدید اختلاف رکھتے ہیں جس کے تحت مواد کو ہیئت پر فوقیت حاصل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کلام حیدری کے اس مضمون کا وجود ہی نہ ہوتا یا اگر اس موضوع پر کلام حیدری قلم اٹھاتے تو کرشن چندر کی تصویر کا ایک دوسرا ہی رخ سامنے آتا جو ماقبل کی آرا یا کرشن چندر کے معتقدین کی آرا سے قطعاً مختلف نہ ہوتا۔ لیکن کلام حیدری کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہ تو مرعوب ہوتے ہیں اور نہ ہی اپنی رائے کے اظہار سے خود کو روک پاتے ہیں۔ ان کی اس فطرت کا علم ان کے اس مضمون سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے منٹو کے تعلق سے لکھا ہے۔

کلام حیدری کا مضمون بعنوان ''منٹو'' رسالہ شاعر کے خاص نمبر (۱۹۵۸) میں شائع ہوا تھا۔ منٹو نے خود کو کبھی ترقی پسند مصنف نہیں کہا البتہ بہت سے ترقی پسند مصنفین سے ان کے تعلقات بڑے والہانہ رہے۔ منٹو کو اپنے ترقی پسند مصنف ہونے سے ہمیشہ انکار رہا اس کے باوجود بعض مصنفین نے انھیں ترقی پسند گردانا تو بعض نے غیر ترقی پسند۔ یہ کشمکش خود ترقی پسند مصنفین و ناقدین کے یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ اسی بنا پر کلام حیدری کا خیال ہے کہ منٹو کے تعلق سے ترقی پسند مصنفین کا رویہ غیر واضح ہے۔ جبکہ منٹو کے یہاں بعض داخلی شواہد اتنے مستحکم ہیں کہ ان کے تعلق سے ترقی پسند مصنفین کا رویہ بالکل واضح ہونا چاہیے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا، اس کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے کلام حیدری لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کی شروع ہی سے چند مخصوص کمزوریاں رہی ہیں۔ لبرل ازم کی زوال پذیر شکل اس میں شروع ہی سے رہی ہے، ان ہی کمزوریوں کے نتیجہ میں منٹو رجعت پسند ہونے کے باوجود عام لوگوں میں ترقی پسند سمجھا جاتا رہا۔''
>
> (منٹو: تفہیمات، ص:۵۸)

اصل میں کلام حیدری ترقی پسند ادبی تحریک کی شروعات میں جس لبرل ازم کی زوال پذیر شکل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ دراصل ترقی پسندی یا حقیقت نگاری کی ہمہ جہتی ہے۔ ادب کو زندگی کا ترجمان

ہونا چاہیے، خود اس نظریے میں بھی خاصا ابہام اور بڑی وسعت ہے۔ ابتدا ہی سے ترقی پسندوں کے یہاں ہیئت اور مواد کے تعلق سے ایک قسم کی کشمکش پائی جاتی ہے۔ کشمکش اس بات میں نہیں ہے کہ ہیئت اور مواد میں کس کو فوقیت دی جائے بلکہ کشمکش مواد کے ساتھ فن کار کے رویے کو لے کر ہے، مواد کی پیشکش کو لے کر ہے۔ مارکسی حقیقت نگاری پر زور بھی ابتدائی دنوں کی بات نہیں بلکہ اس پر اصرار ترقی پسند ادبی تحریک کے دورِ زوال میں شروع ہوا۔ کلام حیدری کے لیے منٹو کی ترقی پسندی کا فیصلہ کرنا اس لیے آسان ہو گیا، کیونکہ ان کے نزدیک جب تک مسائل اور موضوع کے تعلق سے کوئی تعمیری نقطۂ نظر نہ پیش کیا جائے محض مسائل اور موضوع کی پیشکش ترقی پسندی نہیں۔ وہ حقیقت نگاری کے ضمن میں تعمیری اور تخریبی زاویۂ نظر کو ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کے درمیان حدِ فاصل مانتے ہیں۔

منٹو کی افسانہ نگاری کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ابتدائی دور میں منٹو کے یہاں دو رجحانات پائے جاتے ہیں۔ ایک میں بین الاقوامیت پائی جاتی ہے جس میں وسعت بھی ہے لیکن دوسرا رجحان غیر صحت مند اور محدود ہے۔ چونکہ سوال منٹو کی ترقی پسندی اور غیر ترقی پسندی کا ہے اس لیے کلام حیدری بجا طور پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو آگے چل کر منٹو کے یہاں کسی ایک رجحان کو باقی رہنا چاہیے تھا، انھیں کسی ایک راہ کا تعین کرنا چاہیے تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ منٹو نے ایسا نہیں کیا بلکہ آخر تک ان کے یہاں وہ دوسرا رجحان حاوی رہا جسے غیر صحت مند کہا جاتا ہے اور آخر تک منٹو کے افسانوں میں فحاشی اور بیمار جنسی کیفیات سے پُر افسانے پائے جاتے ہیں۔ کلام حیدری طبقاتی شعور اور سماجی شعور کو لازم و ملزوم مانتے ہیں لہٰذا وہ اس بات کی بھی تردید کرتے ہیں کہ منٹو کے یہاں سماجی شعور تو پایا جاتا ہے لیکن طبقاتی شعور نہیں پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ طبقاتی شعور کے بغیر سماجی شعور کا ہونا ممکن نہیں۔ اور یہ بات درست بھی ہے کہ جب طبقاتی شعور کسی فن کار کے یہاں نہیں تو سماجی شعور کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کلام حیدری فحاشی کے خلاف ہیں اور ان کے یہاں فحاشی کا تصور رائج عام تصور سے مشابہ ہے۔ وہ محض جنس کے تصور کو فحش نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک جنسی موضوع کے ساتھ فن کار کے رویے پر فحاشی کا انحصار ہے۔ جب جنس کا تصور خالص جسمانی ہو اور اس میں جمالیات کا احساس نہ ہو تو ایسے تصور کو ادبی نہیں کہا جا سکتا، کلام حیدری اسے نری فحاشی اور بیمار جنسی کیفیت سمجھتے ہیں۔

کلام حیدری کے نزدیک منٹو ایک شعبدہ باز ہیں۔ منٹو کے فن کو بیشتر حیرت زدہ کرنے اور سنسنی پیدا کرنے سے سروکار رہتا ہے۔ منٹو کے فن میں ''چونکانے'' کا عنصر بیش از بیش پایا جاتا ہے۔ اس تعلق سے حسن عسکری جیسے نامور نقاد نے منٹو کی تعریف کی ہے لیکن کلام حیدری کو اس سے اتفاق نہیں۔ وہ چونکا دینے کو کوئی بڑا ادبی کارنامہ نہیں سمجھتے بلکہ شعبدہ بازی گردانتے ہیں۔ لہٰذا اس موقعے پر حسن عسکری جیسا ناقد بھی کلام حیدری کی جرح سے نہیں بچ پاتا۔ اس طرح ایک بار پھر یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ کلام حیدری بڑی سے بڑی اور مسلم الثبوت شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں مرعوب ہونا اور بات ہے، متاثر ہونا اور بات۔ بہر حال منٹو کے فن میں چونکانے کے عمل کے بارے میں کلام حیدری بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں:

> ''سوویت روس نے مصنوعی سیارہ اچھال کر بھی دنیائے سائنس کو چونکایا مگر اس چونکانے اور شب برات میں کسی راہ گیر پر پٹاخہ پھینک کر چونکانے میں جو فرق ہے، وہی فرق اعلیٰ ادبی تخلیق اور منٹو کے افسانے کے چونکانے میں ہے۔ لوگوں کو چونکانا ادب ہی کا ایک مقدس فریضہ نہیں رہا ہے بلکہ تمام علوم و فنون میں نئی ایجاد اور نئی تخلیق نے چونکانے کا مقدس فریضہ ادا کیا ہے۔ مگر اس طرح نہیں کہ اس سے اس کا تقدس الگ ہو جائے۔ فن کار کا اول و آخر فن کار ہونا ضروری ہے، مداری پن آنے کے بعد اس کے شعبدے فن کے خانے میں نہیں رکھے جا سکتے۔''
>
> (منٹو: تفہیمات، ص: ۶۵)

عین ممکن ہے کہ درج بالا اقتباس میں کلام حیدری نے منٹو کے فن کے تعلق سے جو تنقیدی رائے قائم کی ہے اس میں کسی قسم کے تسامح کا دخل ہو۔ لیکن اس اقتباس سے کم از کم یہ تو ثابت ہی ہوتا ہے کہ کلام حیدری فن، فن پارہ اور فن کار کے بارے میں بڑے غور و خوض سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں سکّہ بندی کا تصور کسی بھی سطح پر کام نہیں کرتا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ کرشن چندر پر تنقید کرتے وقت کلام حیدری کا ہدفِ فن

کی باریکی تھی اور منٹو کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے وقت انھوں نے موضوع اور اس کے ساتھ منٹو کے رویے سے زیادہ سروکار رکھا۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کلام حیدری کی تنقید تضاد کا شکار ہوگئی یا یہ کہ آگے چل کر ان کے نزدیک فن کی جزئیات پر مواد کو فوقیت مل گئی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ کرشن چندر کے ناول ''جب کھیت جاگے'' اور منٹو کی افسانہ نگاری کے تعلق سے کی گئی گفتگو کو ایک دوسرے کے متوازی رکھنے پر معلوم ہوگا کہ کلام حیدری ہیئت اور مواد یا موضوع اور فن کی دوئی کو پسند نہیں کرتے۔ کلام حیدری کے نزدیک اچھا فن کار دونوں میں توازن رکھتا ہے اور اس کی تخلیق میں موضوع اور فن باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

کلام حیدری کا مضمون ''تخلیقی عمل: ایک جائزہ'' دراصل وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' پر ایک مفصل اور مبسوط تبصرہ ہے۔ یہ تبصرہ اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر محض تبصرہ نہ رہ کر تنقیدی مضمون بن گیا ہے۔ اس مضمون کو کلام حیدری نے ۱۹۷۹ میں خدا بخش لائبریری کے منعقد کردہ ایک سیمنار میں پڑھا تھا۔ کلام حیدری اس مضمون کا آغاز بڑے ڈرامائی انداز میں کرتے ہیں جس میں ایک قسم کی شگفتگی اور ان لوگوں پر ہلکا پھلکا طنز بھی شامل ہے جو ''خط کا مضموں بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر''۔ مضمون کی ابتدائی سطور ملاحظہ کیجیے:

> ''آج کی صحبت میں وزیر آغا کی کتاب ''تخلیقی عمل'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جسے میں نے پڑھا ہے۔ ہر چند کہ وزیر آغا نے پوری کتاب نہ پڑھ کر اپنے صرف چند سطور سے مطمئن ہونے کا نسخہ بھی بتایا ہے، لیکن میری تشفی ان کے کیپسول سے نہیں ہو سکی۔
>
> ''کچھ اس کتاب (یعنی تخلیقی عمل) کے بارے میں'' لکھتے ہوئے وزیر آغا نے اپنے ان احباب کا پاس رکھتے ہوئے (جن کے پاس پوری کتاب پڑھنے کا وقت نہیں ہے) مختصر ترین الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔
>
> چلیے اب بات شروع کرنے کے لیے ہم ان کے اس کیپسول سے ہی شروع کرتے ہیں۔''
>
> (تخلیقی عمل ایک جائزہ، تفہیمات، ص:۷۴تا۷۵)

کلام حیدری کا یہ عمل آ بیل مجھے مار کے مترادف ہے۔ اگر وہ ان چند سطور کو نہ لکھتے تو بھی نفس مضمون پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن کلام حیدری جیسا کھرا لکھاری سہل پسندی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ کلام حیدری کا مقصد ادب میں سہل پسندی پر طنز کرنا نہیں بلکہ خود نمائی ہے اور وہ دراصل یہ جتانا چاہتے ہیں کہ میں نے پورا مضمون پڑھا ہے۔ لیکن اسی بات کو دوسرے زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس تنقیدی تبصرے کی اوریجنلٹی کے اظہار کے لیے اور اپنے طنز کو مزید مستحکم کرنے کے لیے کتاب کی مکمل قرات کی وضاحت ضروری تھی۔ وزیر آغا کے تنقیدی عمل کے بارے میں کلام حیدری کی رائے جاننے کے لیے دو اقتباس پیش کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس سے خود کلام حیدری کے وژن اور اس کی شفافیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہوتا یہ ہے کہ ہمارے بیشتر نقاد سائنس، فلسفہ اور ادب کے باہمی رشتوں، دوریوں اور انضمام----ان سب کا تجزیہ اس لیے نہیں کر پاتے کہ وہ اپنے مزاج کے مطابق ان باتوں کو ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میری مراد یہ ہے کہ پورے تنقیدی یا تجزیاتی عمل میں وہ OBJECTIVE ہونے کی بجائے SUBJECTIVE ہوتے ہیں۔''
>
> (تخلیقی عمل ایک جائزہ: تفہیمات، ص:۷۷)

اس اقتباس سے تین باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلی یہ کہ کلام حیدری ادبی مسائل اور امور پر پینی نگاہ رکھتے ہیں، متعلقات ادب کے بعض دوسرے علوم اور ادب کے مابین جو قرب و بعد کی ہم آہنگی ہے اس کا شعور رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ تنقیدی عمل کے دوران ہمارے بیشتر نقاد کس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، یعنی ان کے نزدیک نقاد کو معروضیت کی روش اپنانی چاہیے۔ تیسری بات یہ کہ وزیر آغا ایسے نقادوں سے الگ ہیں جو تنقیدی عمل کے دوران SUBJECTIVE ہو جاتے ہیں، ان کے یہاں معروضیت غالب رہتی ہے۔ اب دوسرا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''پہلے موضوع ان کے ذہن میں مدتوں اودھم مچاتا ہے، پھر وہ عالمگیر شہرت کے مالک موضوع خاص کے ماہرین کی کتابیں پڑھتے ہیں،

> پھران تمام باتوں کی جگالی کرتے ہیں، تب اپنے ذہن اور شعور کے ساتھ ان کو ملاتے ہیں، پھر ترتیب دیتے ہیں اور تب ان باتوں کو قرینے اور سلیقے سے نہایت منطقی طور پر سپرد قلم کرتے ہیں...دانش اور شعور کو استعمال میں لانے والے نقاد اردو میں کہاں ہیں؟''
>
> (تخلیقی عمل ایک جائزہ: تفہیمات، ص:۷۸)

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ معروضیت خود بخود نہیں آتی بلکہ اس کے لیے محنت شاقہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ محنت شاقہ کن مراحل اور مدارج سے گزرتی ہے، اس کا اظہار کلام حیدری نے بالترتیب کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے وزیر آغا ان مدارج و مراحل سے گزرنے کے بعد ہی معروضیت سے متصف ہوتے ہیں۔ یہاں ایک بار پھر وسعت مطالعہ اور مطالعے کی عادت پر زور دیا گیا ہے۔ اس اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وسیع مطالعے کے بعد جو کچھ بھی عرفان ہوتا ہے اس کی پیشکش میں منطقیت اور شفافیت اسی وقت آتی ہے جب نقاد موضوع سے متعلق مباحث اور مسائل کو ہضم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو (یعنی جگالی کرنے کی اہمیت کو جانتا ہو)، بصورت دیگر تحریر میں شفافیت کے بجائے انتشار اور بکھراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو ایک کامیاب تقلیدی عمل ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ جب دانش اور شعور کا استعمال بھی ہو جائے تو تحریر میں اجتہادی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان دونوں اقتباسات میں غور کرنے کی بات یہ بھی ہے کہ جہاں اردو تنقید میں تحسین باہمی اور داد و دہش کی عام روایت رہی ہے اور اس مقصد کے لیے تنقیدی عمل کے دوران عبارت آرائی، خوشنما جملوں اور لفاظی سے بیش از بیش کام لیا جاتا ہے وہیں کلام حیدری کا ہر جملہ اور ہر لفظ بہت سوچا سمجھا ہوا ہے۔ پوری عبارت علت و معلول کے رشتے سے منسلک ہے جس کے سبب نقطۂ نظر میں معروضیت در آئی ہے۔ یہی معروضیت اور نقطۂ نظر کلام حیدری کا وصف ہے۔

کلام حیدری کو وزیر آغا کی ایک اور کتاب نے خاصا متاثر کیا۔ اس کتاب کا تعلق اقبالیات سے ہے۔ کتاب کا نام ہے ''تصورات عشق وخرد: اقبال کی نظر میں''۔ اس کتاب نے کلام حیدری کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ اپنی رائے کے اظہار سے خود کو روک نہ سکے۔ اس طرح وزیر آغا کی ایک اور کتاب پر کلام حیدری کا بھرپور تبصرہ سامنے آیا۔ اس تبصرے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کلام حیدری نے مکمل کتاب کا مطالعہ کیا

ہے۔ وزیر آغا کی اس کتاب نے کلام حیدری کو اس قدر کیوں متاثر کیا، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے کلام حیدری لکھتے ہیں:

> ''اقبال صدی سے قبل بھی اقبال پر کم نہیں لکھا گیا ہے، مگر 'صدی' کے طفیل میں مضامین اور کتابوں کی جو بھیڑ بھاڑ ہے اس میں وزیر آغا کی کتاب ''تصورات عشق وخرد ----------- اقبال کی نظر میں'' واحد کتاب ہے جو مجھے متاثر کر سکی ہے۔ میرا متاثر ہونا کوئی سند نہیں ہے --------- مگر میرے لیے مسرت کی بات ضرور ہے کہ عزیز احمد کی کتاب ''اقبال ------- نئی تشکیل'' کے بعد اس کتاب نے مجھے متاثر کیا۔ کتاب پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ میں کتاب پڑھنے سے قبل جو تھا وہ کتاب پڑھنے کے بعد نہیں ہوں، مجھ پر کچھ انکشافات ہوئے ہیں ------- تو میں سمجھتا ہوں، یہ کتاب اہم ہے ورنہ پھر وہ کتاب کیوں ہے؟''
>
> (تصورات عشق وخرد ------ اقبال کی نظر میں: تفہیمات، ص:۹۵)

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام حیدری کو اپنے بارے میں نہ تو کوئی خوش فہمی ہے اور نہ ہی وہ خود شناسی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ نہ ہی ان کے یہاں اس رویے کی کوئی جگہ ہے کہ ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کسی کتاب کو پڑھنے کے بعد کچھ انکشاف ہونے سے کیا مراد ہے؟ ایک ہی موضوع سے متعلق دو کتابوں (جن میں مواد بھی یکساں ہو) میں سے کسی ایک کتاب کا مطالعہ ممکن ہے کسی شخص کی معلومات میں اضافہ کا سبب بنے۔ اس طرح تو ہر کتاب فی نفسہ معلومات میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ ظاہر ہے یہاں اس قسم کے انکشاف کا ذکر نہیں کیا جا رہا۔ اول تو میں سمجھتا ہوں انکشاف میں معلومات اور عرفان دونوں شامل ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی کتاب کا مطالعہ انکشافات کا سبب بنے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے موضوع پر زیر مطالعہ کتاب ماقبل کی کتابوں سے قائم ہونے والے علم و عرفان میں کیا اضافہ کرتی ہے۔ یہی اضافہ کسی کتاب کی اہمیت کو مسلم کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کلام حیدری کا متاثر ہونا کسی جذباتی یا تاثراتی کیفیت کا حامل نہیں بلکہ معروضی نقطۂ نظر کا زائیدہ ہے۔ کلام

حیدری اسی رو میں آگے لکھتے ہیں:

''مگر میں اس تاثر کو کیا کروں، جو اس کتاب کو پڑھنے کے بعد پیدا ہوا؟----------اقبال کو مذہبی علما کی مجلس سے اٹھا کر عام لوگوں میں بٹھانے کی کوشش کی داد نہ دینا---------- نہیں نہیں، میں یہ گناہ اپنے سر نہیں لے سکتا۔''

(تصوراتِ عشق وخرد------اقبال کی نظر میں: تفہیمات، ص:۹۶)

ان دونوں اقتباسات کا تعلق وزیر آغا کی کتاب پر تبصرے کی تمہیدی گفتگو سے ہے۔اس تمہید کی میرے نزدیک خاص بات یہ ہے کہ یہاں تمہید کاغذ کا پیٹ بھرنے یا خودنمائی کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ اس تمہید نے جہاں ایک طرف کلام حیدری کے تبصرے کی نوعیت کو واضح کیا ہے وہیں دوسری طرف بڑی حد تک موضوع کے تعلق سے وزیر آغا کے نقطۂ نظر کو بھی واضح کر دیا ہے۔اس تمہیدی گفتگو سے موضوع کے بارے میں وزیر آغا کی سمت اور رفتار کا ادراک بھی بڑی حد تک ہو جاتا ہے۔کلام حیدری، وزیر آغا کے بڑے معترف اور مداح ہیں لیکن جب کوئی بات انھیں کھٹکتی ہے تو وہ اس کی گرفت بھی کرتے ہیں اور اظہار بھی۔مثال کے طور پر درج ذیل سطور ملاحظہ کیجیے:

''سب سے پہلے تو میں وزیر آغا کی اس بات سے متفق نہیں ہوں کہ 'اسلامی کلچر' نام کی کوئی چیز جغرافیائی حدود کو توڑتی ہوئی وجود میں آئی بھی تھی---------------وہ کیا چیز ہے جسے وزیر آغا اسلامی کلچر کہہ رہے ہیں۔قرآن میں 'اسلامی کلچر' کہاں پر ہے؟ کلچر کس آسمانی کتاب میں ہے؟ قرآن کی روشنی میں وہ کلچر کہاں پر ہے جسے وزیر آغا کہتے ہیں کہ اقبال نے پیش کیا؟ دراصل کلچر کا تعلق مذہب سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جیسے بہت سے عناصر میں مذہب بھی ایک عنصر ہو...کلچر کا پورا تصور ہی وزیر آغا کے یہاں غیر حقیقی اور فرضی بنیادوں پر ہے۔''

(تصوراتِ عشق وخرد: اقبال کی نظر میں: تفہیمات، :۱۰۸تا۱۰۹)

وزیر آغا کے کمالات کا اعتراف کرنے اور بھرپور ستائش کرنے کے باوجود کلام حیدری نے درج بالا اقتباس میں ان سے شدید اختلاف کیا ہے۔اس کی شدت کا اندازہ آخری جملے سے لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس مقام پر کلام حیدری بھی OBJECTIVE کے بجائے SUBJECTIVE ہو گئے۔ پتہ نہیں انھیں 'اسلامی کلچر' کی تردید پر اتنا اصرار کیوں ہے۔ان کے نزدیک کلچر کا کیا تصور ہے اس کی بھی وضاحت مفقود ہے۔قرآن میں اسلامی کلچر کی تلاش سے ان کی کیا مراد ہے؟ یہ بھی واضح نہیں۔یعنی وہ قرآن میں اسلامی کلچر کی ترکیب تلاش کر رہے ہیں یا وہ عناصر جس سے کوئی مخصوص کلچر تشکیل پاتا ہے۔بار بار قرآن اور آسمانی کتاب کا حوالہ مانگنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی کلچر کی دلیل یا وجود و اثبات انھیں اسلامی مذہبی لٹریچر سے چاہیے۔تو پھر صرف قرآن ہی کیوں؟ اس کے ساتھ حدیث اور فقہ کیوں نہیں؟ اور پھر ''کلچر کا تعلق مذہب سے صرف اس حد تک ہوتا ہے جیسے بہت سے عناصر میں مذہب بھی ایک عنصر ہو۔'' اس جملے کا کیا مطلب ہوا؟ اگر اس جملے میں عناصر سے مراد وہ عوامل ہیں جو کلچر کی تشکیل کرتے ہیں اور مذہب بھی ایسا ہی ایک عنصر ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب بھی کلچر کی تشکیل کا ایک سبب ہے۔اگر مذہب بھی کلچر کی تشکیل کا ایک سبب ہے تو جغرافیائی اور قومی حدود کے ساتھ ساتھ اسلامی کلچر یا کوئی بھی دوسرا مذہبی کلچر بھی اپنا وجود رکھتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کلام حیدری اسلامی کلچر سے گھبرا گئے ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک اسلامی کلچر کرتا پائجامہ،ٹوپی، جبہ و دستار اور عمامہ کا نام ہے۔شاید اسی لیے وہ بار بار جغرافیائی حدود کا حوالہ دیتے ہیں اور اسلامی کلچر کے موقف کو قرآن کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔وزیر آغا نے سرسید کے موقف کو قومی اعتبار سے صائب اور بنیادی طور پر سطحی قرار دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس موقف کو قبول کر لینے کی صورت میں ''ممی ڈیڈی'' تہذیب، اسلامی تہذیب پر غالب آ جاتی۔کلام حیدری وزیر آغا کے اس موقف سے بھی شدید اختلاف کرتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وزیر آغا نے سرسید کا مطالعہ گہرائی اور صبر کے ساتھ نہیں کیا ہے۔وزیر آغا نے ''ممی ڈیڈی تہذیب'' کی اصطلاح استعمال کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ امی کو ممی کہنے اور ابا کو ڈیڈی کہنے کے خلاف ہیں اور ان کے نزدیک امی حضور اور والد صاحب قبلہ کہنا اسلامی تہذیب ہے۔ بلکہ بعض مذہبی معاملات میں سرسید کے ان رجحانات کی طرف

اشارہ ہے جس کے نتیجے میں برطانوی تہذیب یا مغربی تہذیب غالب آجاتی۔ اوراس معاملے میں کسی صبر کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ صبر کی صورت میں نتیجہ وہی نکلتا جسے وزیر آغا ''قومی اعتبار سے صائب'' کہتے ہیں۔ مجموعی طور پر وزیر آغا کی کتاب پر کلام حیدری کا یہ تبصرہ چشم کشا اور بصیرت افروز ہے۔

''حسرت اور صحافت'' یہ مضمون کلام حیدری نے نومبر ۱۹۸۱ میں بہار اردو اکیڈمی کے ایک سیمینار میں پیش کیا تھا۔ ظاہر ہے حسرت موہانی کی شخصیت گونا گوں پہلو کی حامل تھی۔ وہ مجاہد آزادی بھی تھے اور اردو شعر وادب کے اہم تخلیق کار بھی، انھوں نے صحافت کے میدان میں بھی قدم رکھا۔ اسی لیے کلام حیدری نے انھیں مرد آہن اور مرد آہنگ کہا ہے۔ کلام حیدری کا یہ مضمون دراصل بحیثیت صحافی حسرت موہانی کے کارناموں کا جائزہ لیتا ہے۔ لیکن مضمون کی ابتدائی سطور میں کلام حیدری نے بحیثیت مجاہد آزادی اور مرد میدان سیاست ان کی اہمیت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ جس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ حسرت ایک پر خلوص انقلابی اور دل ناصبور کے حامل تھے۔ انھوں نے سیاست کا کھیل دماغ سے نہیں کھیلا بلکہ اس بساط پر دل کی دنیا آباد کی۔ یہ محض دعویٰ نہیں بلکہ اس کی دلیل میں کلام حیدری نے تین واقعات پیش کیے ہیں:

''نئے دستور پر رائے شماری ہوئی تو ۱۹۴۹ء میں حسرت واحد فرد تھے، جو ہندوستان میں سوویت نظام چاہتے تھے یہ تنہا انقلابی آواز تھی جو نئے دستور کے خلاف اٹھی اور ہندوستان کا دستور حسرت کے دستخط سے محروم رہ گیا... ۱۹۲۱ میں کانگرس اور خلافت کانفرنس دونوں کے اجلاس ہوئے۔ حسرت نے مکمل آزادی کی تجویز کانگرس اجلاس میں پیش کی۔ مہاتما گاندھی کی حمایت نہ ملی۔ اکثریت سے تجویز رد کردی گئی۔ خلافت کانفرنس کی سبجکٹ کمیٹی میں یہی تجویز پاس ہوگئی۔

اور صرف آٹھ برس بعد ۱۹۲۹ء میں ۲۶ر جنوری کو مکمل آزادی کی تحریک جواہر لعل نہرو کی قیادت میں پاس ہوئی۔

بات یہ ہے کہ حسرت کے پاس دل ناصبور تھا اور سیاست شطرنج کا کھیل۔! حسرت شطرنج کے کھیل کے آدمی نہیں تھے۔ وہ بساط ہی

الٹ دینے والے انقلابی تھے۔''

(حسرت اور صحافت، تفہیمات، ص:۱۱۶)

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ درج بالا بیان اشاراتی ہے یا مفصل۔ اشارت اور صراحت کا ایسا امتزاج کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

کلام حیدری کے تبصرے اور ان کی رائیں بے لاگ اور بے باک ضرور ہوتی ہیں لیکن ان کا مقصد کسی قسم کا تنازعہ کھڑا کر کے سستی شہرت کا حصول ہرگز نہیں ہوتا اور نہ ہی خودنمائی اور انانیت کا ذوق اس میں شامل ہے۔ وہ چیزوں کو ان کے مقام پر رکھ کر دیکھنے کے عادی ہیں اور اس میں وہ کسی قسم کی تخفیف یا زیادتی کو روا نہیں رکھتے۔ ایک مجاہد آزادی اور پرخلوص سیاست داں کی حیثیت سے وہ حسرت کے مداح ہیں لیکن جب بات فن اور شاعری کی آتی ہے تو وہ محاسبے سے گریز بھی نہیں کرتے۔ حسرت کی شاعری کے بارے میں کلام حیدری لکھتے ہیں:

''حسرت شاعر بھی تھے اور ہر چند کہ کوئی عہد آفریں شاعر نہ تھے۔ مگر آواز اور لہجہ اتنا منفرد ضرور ہے کہ پہچانے جاسکتے ہیں۔ بحیثیت غزل گو حسرت کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے جوان غزلوں کے ذریعہ غزل کو اس کا صحیح حق دیا۔ حسرت غزلوں میں جوان رہے۔ اور جب بہ اعتبار عمر ڈھلے تو غزلیں بھی ڈھل گئیں اور وہ کشش نہ رہی۔''

(حسرت اور صحافت: تفہیمات، ص:۱۱۷)

کلام حیدری کا موضوع حسرت موہانی کی صحافت ہے لیکن مضمون کے ابتدائی سوا تین صفحات ان کی سیاسی حیثیت اور شاعری پر صرف ہوئے ہیں۔ اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ صفحات کالے کر کے مضمون کو طول دینے کی کوشش کی جارہی ہے اس لیے کلام حیدری اس امکانی مغالطے کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان دو پہلوؤں کا تھوڑا سا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ انھیں صحافی کے روپ میں دیکھنے سے جو مایوسی ہوتی ہے اس سے کہیں یہ نہ

سمجھ لیا جائے کہ میں حسرت کی اہمیت کا منکر ہوں کوئی ضروری نہیں کہ
ایک قد آور شخصیت جن جن شعبوں میں داخل ہو، ان سب میں یکساں
طور پر کامیاب ہو۔''

(حسرت اور صحافت: تفہیمات، ص:۱۱۷)

اس ذرا سی وضاحت نے موضوع کے تعلق سے کلام حیدری کی سمت کا تعین کر دیا۔ یہ کلام حیدری کا وصف خاص ہے جو ان کے تقریباً ہر مضمون میں نظر آتا ہے۔ ان کے اس طرز عمل سے قاری کی دلچسپی بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ کچھ نیا اور کچھ الگ کہنے کا اشارہ پہلے ہی مل جاتا ہے۔ قاری کو کلام حیدری کی منشا کا ادراک پہلے ہی ہو جاتا ہے لیکن مضمون کی قرات میں دلچسپی ان دلائل کی تلاش کے سبب ہوتی ہے جو مضمون نگار پیش کرتا ہے۔

کلام حیدری کے نزدیک حسرت موہانی ایک ناکام صحافی تھے۔ اس کی وجہ وہ صحافت کے تعلق سے حسرت کی بے دلی اور سیاسی مشغولیات کے سبب عدیم الفرصتی کو سمجھتے ہیں۔ اگر کلام حیدری نے اردوئے معلیٰ کے بعض نقائص کی طرف توجہ نہ دلائی ہوتی تو یہ محسوس ہوتا کہ کلام حیدری کو حسرت سے ''کامریڈ'' یا ''زمیندار'' جیسے کسی رسالے یا اخبار کی توقع تھی۔

''پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے'' یہ مضمون بھی بہار اردو اکیڈمی کے سیمینار میں پڑھا گیا تھا جس کا انعقاد اکتوبر ۱۹۸۰ میں ہوا تھا۔ کلام حیدری نے اس مضمون کا مقصد پریم چند کے فن یعنی مختصر افسانے اور ناول کو فن کی کسوٹی پر پرکھنا بتایا ہے۔ اور اس عمل میں ان کا سامنا سب سے پہلے اس سوال سے ہوتا ہے:

''میں اس سوچ میں مبتلا ہوں کہ پریم چند کے افسانے اور ناول پہلے
وجود میں آئے یا ان کے افسانوں میں جو فن ہے وہ پہلے وجود میں آیا؟''

(پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے، تفہیمات، ص:۱۲۴)

اس کے بعد کلام حیدری کو ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے یعنی خیالات اور الفاظ کے تصادم سے۔ یہ تصادم پریم چند کی کہانیوں اور ناولوں کی قرات سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تعلق سے انھوں نے جو لکھا

ہے وہ معنی خیز ہے:

''اب افسانے کا فن کدھر رہ گیا خیال ہی نہیں آتا،
----------ایک لمحے کے لیے روپ فن کا بھی آتا ہے مگر پھر زندگی
پھوٹ پڑتی ہے اور جب زندگی پھوٹ پڑتی ہے تو اس پر یعنی فن پر
نقاب سی پڑ جاتی ہے، دھندسا چھا جاتا ہے اور جاڑے کے کہاسے میں
ویسے ہی دھندلا جاتا ہے جیسے رامو کی گائے -------- یا شامو کی
جھونپڑی----------''

(پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے: تفہیمات، ص:۱۲۶)

پریم چند کے افسانوں اور ناولوں کی قرات کے دوران قاری کو بیشتر اس تصادم سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کی وجہ پریم چند کی افسانوی دنیا کا تنوع اور رنگارنگی ہے۔ یہاں کسان بھی ہے مزدور بھی، ظالم بھی ہے مظلوم بھی، زمیندار بھی ہے اور سودخوار بنیا بھی، بھائی بھی ہے اور سوتیلی ماں بھی، جدوجہد آزادی میں عملاً شریک نوجوان بھی ہے اور استعمار کی وظیفہ خوار پولیس بھی، ایک طرف دیہات کی زندگی ہے تو دوسری طرف شہری ہلچل بھی۔ گویا مضمون کی ابتدا ہی میں کلام حیدری اس بات کا اعلان کر دیتے ہیں کہ پریم چند کے یہاں فن تو ہے لیکن زندگی کی رمق اتنی زیادہ ہے کہ فن کی موجودگی کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اس کے بعد کلام حیدری بڑی آہستگی کے ساتھ فن کے مباحث میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مواد ہیئت کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ یعنی ہیئت کا انحصار مواد کی نوعیت پر ہے۔ اپنے اس خیال کو پریم چند سے مربوط کرتے ہوئے کلام حیدری لکھتے ہیں:

''پریم چند پہلے ہیئت اور تب مواد تخلیق نہیں کرتے جیسا کہ آج
بہکے ہوئے جدید ادب کے نقلی فن کار کرتے ہیں، ان کے قدم اس تیز
CURRENT میں جمتے ہی نہیں ہیں، اس لیے وہ تخلیق کے عمل ہی
کو REVERSE کر دیتے ہیں۔''

(پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے: تفہیمات، ص:۱۲۷)

اس اقتباس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ایک تو یہی کہ کون سا فن کار پہلے ہیئت تخلیق کرتا ہے۔ اور دوسری بات، کیسے معلوم ہوگا کہ فلاں تخلیق میں پہلے ہیئت اور پھر اس ہیئت میں مواد کو بھرا گیا ہے۔غالبًا یہ سوال کلام حیدری کے ذہن میں بھی ابھرے ہوں گے۔اسی لیے انھوں نے پریم چند اور نئے افسانہ نگاروں کے درمیان ایک ایسے رشتے کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جس سے مفر ممکن ہی نہیں۔اس رشتے کو مستحکم بنیاد فراہم کرنے کے لیے وہ پریم چند پر دی گئی نئے افسانہ نگار کی رائے کو ہی صائب تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ بات صحیح ہے کہ نیا افسانہ نگار آخر کس معنی میں ہوگا اگر وہ پریم چند کی پیروی کرے، لیکن آدمؑ سے اپنی مشابہت سے نہ آدمی انکار کرسکتا ہے اور نہ پریم چند سے مشابہت سے نیا افسانہ نگار۔''
>
> (پریم چند کے افسانے فنی نقطۂ نظر سے: تفہیمات، ص:۱۳۹)

اس مضمون میں جہاں تک پریم چند کے افسانوں اور ناول کے تعلق سے فنی جائزے کی بات ہے، چند باتیں قابل توجہ ہیں۔

۱۔ پریم چند شروع سے آخر تک بیانیہ تکنک کے ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔

نوٹ: پریم چند سے ذرا قبل اور ان کے معاصرین میں ہر کوئی بیانیہ تکنک کا ناول نگار یا افسانہ نگار رہے۔ظاہر ہے یہ کوئی پریم چند کا اختصاص نہیں اور نہ ہی پریم چند اس تکنک کے موجد یا اس تکنک کو سب سے پہلے استعمال کرنے والوں میں سے ہیں۔

۲۔ پریم چند کے یہاں PRIMITIVE SEUSIBLITY پائی جاتی ہے۔

نوٹ : اس بات کا فن سے کیا تعلق ہے؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں۔اگر کسی افسانہ نگار یا ناول نگار کے یہاں یہ عنصر نہ پایا جائے تو کیا فن کمزور ٹھہرے گا۔کیا یہ عنصر افسانے کے فن کے لیے لازمی ہے؟

۳۔ پریم چند کی کہانیاں اس اونچے پہاڑ کی طرح ہیں جس پر چڑھ کر ساری دنیا کو دیکھا جاسکتا ہے۔

نوٹ : یہ جملہ بھی تاثراتی نوعیت کا ہے اس سے کسی قسم کی معروضیت کا پتہ نہیں چلتا۔البتہ مواد یا

موضوع کی عظمت کے تصور سے ہی ایسا جملہ نکل سکتا ہے کیونکہ یہاں مواد اور موضوع کے تعلق سے فن کار کے رویے یعنی پیشکش اور اسلوب کا تجزیہ کیا ہی نہیں گیا۔اس مضمون میں وہ کلام حیدری نظر نہیں آتے جو دیگر مضامین میں اپنی موجودگی کا احساس اور اپنے منفرد تنقیدی نقطۂ نظر کے وجود کا نمایاں طور پر احساس کراتے ہیں۔

کلام حیدری کا تنقیدی اسلوب ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔وہ ادب کا گہرا شعور رکھتے ہیں۔ اُن کا اپنا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہے۔انھوں نے سنجیدگی اور گہرے کمٹ منٹ کے ساتھ تنقید لکھنے کی کوشش نہیں کی۔طنز و تعریض، چونکانے کا عمل، خود کو منفرد سوچ کا حامل نقاد بننے بنانے کے چکر میں تنقید کی ڈور ان کے ہاتھوں سے ڈھیلی ہوتی چلی گئی۔اگر وہ پورے انہماک اور نظم وضبط کے ساتھ تنقید کی طرف متوجہ ہوتے تو یقیناً وہ بڑے نقاد ہوتے۔انھیں نئے نکتے پیدا کرنا اور نئی بات پیش کرنے کا ہنر آتا تھا۔زبان و بیان پر ان کی گہری گرفت تھی۔وہ کوئی بھی بات سرسری طور پر کہنے کے عادی نہیں تھے بلکہ ان کا اپنا شعور و ادراک ان کی تحریروں میں محلول ہوجاتا تھا جو اُن کی تحریروں کو بیش قیمت بناتا تھا۔بلا شبہ کلام حیدری کے یہ مضامین ہمیں دعوت فکر و نظر دیتے ہیں اور اردو تنقید میں کلام حیدری کو ایک مخصوص مقام بھی عطا کرتے ہیں۔

انتخابِ نگارشات

- سخی (افسانہ)
- زندگانی (افسانہ)
- روشنی کی ضمانت (افسانہ)
- اپنی زندگی کے کچھ سچ (خودنوشت)
- منتخب اداریے

❋

سخی

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا سا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے، میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے، کبھی پچاس، کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے، یہ میں نہیں جانتا، یہ کیا کرتا ہے، یہ بھی نہیں جانتا۔ یہ منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے، صرف یہ میں جانتا ہوں—بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین، بیڑی دکان پورنیہ——

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگالی ہے اور بالائی ہونٹوں سے اُلجھ رہی ہے، میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ، ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں، میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لیے اس کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا ''معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجیے۔'' چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

اور میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھالی ہے۔ اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج ہوگی۔ میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے اور میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے۔ جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے، آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلا ہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ایک کے سر پر ''دلّی والوں'' جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال اُلجھے اُلجھے ہیں اور دونوں پھر اندر آ جاتے ہیں۔

اور میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے اچانک وہ زور سے کھڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھڈّی ہاتھوں پر رکھے کسی اردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا۔ چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور دلّی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیر مال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے، جیسے اسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو، میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اور اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی۔ اب تک وہ ایڈیٹر نہیں آیا جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں میں

نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھیپ سکوں۔

دلّی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیر مال رکھی ہوئی ہے، اوپر کا سرخی مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے اور میں سوچ رہا ہوں۔ مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اور اس کے کوئی بچہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں کہ اس کے کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دلّی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اُس کا ساتھی آدھی سے زائد شیر مال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا اور میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیے ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی، کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی، مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا اور تب میں سوچتا ہوں۔ یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار وغیرہ ہوگا یا پھر دوست ہو سکتا ہے اور سکینہ......

اب کیا تُک ہے کہ ایڈیٹر وعدہ کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے، شرافت حسین اور سکینہ کی رشتہ داری کی نوعیت کی فکر ہے۔ مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیر مال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں، گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کرنے کے بعد میں نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی ۱۳ تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے، ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں کہ سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی، اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے

وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلاہٹوں میں ہے وہ فراق یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جدا ہوجانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا——— سوچ رہا ہوں، یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس میں سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کرچکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نے اسے ٹیبل سے اٹھایا نہیں ہے، تو یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کردے گی اور میری جیب میں پانچ آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر، اور یہ زکریا اسٹریٹ، اور یہ دلکشا ہوٹل———

دل سے مانتا ہوگا مولا بخش سکینہ کو جبھی تو———

اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اور اب وہ میرے قریب آگیا ہے اور کہہ رہا ہے ''ہم کل آئیں گے جی— آپ رہیں گے نا———؟''

میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا......

میں اس وقت اپنی کوٹھی کی ایک چوکی پر پڑا ہوں، میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیہ سے دبے پڑے ہیں اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی سی محسوس کررہا ہوں۔

اس کلینڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے جس پر ایک امریکن عورت ہوائی جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے میں امریکن کلینڈر میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں، بھوک لگ رہی ہے، بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں، ڈوری پر ٹنگا ہوا پینٹ پہن لیتا ہوں——

میں سوچ رہا ہوں، ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا۔ کچھ سہارا ہوجائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا اور تب سوچتا ہوں انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں۔

اور میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے اور میں اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں، بی بی سکینہ۔ معرفت

شرافت حسین بیڑی دکان۔ پورنیہ۔ مولا بخش......ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ساتھ ہی کوٹھری میں تالا بند کرکے سڑک پر آگیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے وہ کہے تو میں منی آرڈر لگا دوں۔

''آپ—؟'' وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے، ایک کام ہی اس کا کردوں گا تو چھوٹا ہوجاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہوگئی ہے اور میں دلکشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں۔ میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیرمال، قورمہ اور سیخ کباب لاکر رکھا ہے اور میں بغور اس شیرمال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم، بے حد لذیذ اور خوبصورت نظر آرہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اور اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جارہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے، کوئی ٹیوشن نہیں ملی، نوکری نہیں ملی اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا، ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سنیما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے ڈال دیے ہیں۔

میں شیرمال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلّت محسوس ہو رہی ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اتر رہا ہوں۔ پانچویں منزل سے اترتے اترتے پاؤں دکھنے لگے ہیں اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے لوٹتے اب مجھے لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن دور کر رہا ہوں۔

میری جیب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رخ کولوٹولہ کی طرف کر دیا ہے۔ چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آ گیا ہوں جو جاپانی بمباری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آ گیا ہوں جہاں اردو رسالوں کی دکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔

سکینہ کا خیال مجھے آتا ہے، پھر مجھے اس کوٹھی کا خیال آتا ہے جو تھیٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لیے آج شام کو بلایا گیا ہے کیا پتہ آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے، وہی زکریا اسٹریٹ اس کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔

''ایک غریب مر گیا ہے، کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجیے۔''

میں قریب جاتا ہوں، میں چونک جاتا ہوں، میں پھر قریب جاتا ہوں۔ فیتے سے بند ہونے والی گنجی، ایک کان کی کٹی ہوئی لو۔

مولا بخش ——؟ میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں۔ سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں یہ کیسے مرا؟ ''ٹرک سے کچل کر'' نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے۔ ناخدا مسجد ہے، مولا بخش ہے، جس کے کفن دفن کے لیے ایک آنے دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں، وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے ——

(صفر —— کلام حیدری)

افسانہ :

زندگانی

ہلکی اندھیری رات کے بھرپور سناٹے میں وہ اجلا، چھوٹا مگر لمبا سا مکان ایک پراسرار مگر پختہ یقین کی طرح کھڑا ہوا اپنے اندر سے شکوک میں ڈوبی ہوئی مدھم، لڑکھڑاتی اور لرزتی ہوئی روشنیوں کو باہر پھینک رہا تھا، جیسے دھند میں گھرا ہوا خواب اور خواب میں ڈوبی ہوئی پراسرار سازشی اور رازدارانہ آواز ذرا سا وجود میں آ کر ہوا میں تحلیل ہو جائے۔

اس لمبے، اجلے اور چھوٹے سے مکان کی تیسری منزل کے واحد کمرے کے دریچے کی خوبصورت روٹ، آئرن کی خوبصورت، گرل کے جھکاؤ، زاویوں، گولائیوں سے آہستہ روی سے سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی بیحد ہلکی سی سبزی مائل روشنی پھوٹ پھوٹ کر بہہ رہی تھی۔

اس تیسری منزل کے واحد کمرے کی ٹیک ووڈ کی آڑے ترچھے نقوش والی چم چم کرتی مسہری کے ایک کنارے پر وہ اپنی خواب آلود نیم وا آنکھوں سے دریچے کے باہر اس خوبصورت اندھیرے کو دیکھ رہا تھا جسے کمرے کے اندر روشن بلب نے باہر ہی روک رکھا تھا۔

اس شاندار مسہری کے دوسرے کنارے پر وہ اپنی نشہ آور آنکھوں سے کمرے کے اندر رکھے ہوئے وارڈروب کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے اپنے ڈائرکشن میں تیکھے ڈیزائن کا بنوایا تھا۔

دونوں الگ الگ سمت منہ کیے تھے مگر دونوں کی پیٹھ ایک دوسرے سے مَس کر رہی تھی۔

مرد سینڈو گنجی پہنے ہوا تھا۔

اور اس کی بیوی صرف ایک ٹرانسپیر نٹ بریشیر۔

دونوں کی آنکھوں کو اب نیند کے پہلے جھونکے نے بند ہونے پر مجبور کرنا شروع کر دیا، آنکھیں

بند تھیں، مگر ذہن ابھی بند نہیں ہوئے تھے۔

مرد نے محسوس کیا اُس کی پیٹھ کا کھلا حصہ اس کی بیوی کی گردن کے نیچے والے حصے سے مس ہو رہا ہے۔

اس کی گردن کے نیچے والا حصہ پچھلا حصہ ہی تو اس کی کمزوری بن کر کئی بار اسے بوسہ لینے پر ورغلا چکا تھا۔

وہ جو کالج کی خوب صورت لڑکیوں میں سے ایک تھی جس کے زاویوں، قوسوں اور عمودی بناوٹوں نے تہلکہ مچا رکھا تھا، شاید اس کے حسن میں 'حسنِ سراپا' والی شاعرانہ خصوصیت نہ ہو لیکن اگر جنسی کشش کسی عورت کے حسن کا معیار بن سکتی ہے تو وہ بے انتہا خوب صورت تھی، بے حد گمراہ کن بے حد اشتعال انگیز——

اور آج وہ کتنی بلا کی اشتعال انگیز لگ رہی تھی، کس قدر! اس کے خبر کرنے پر وہ ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن پہنچ گیا تھا، وہ دہلی جا رہی تھی اور وہاں سے لندن!

بیس منٹ کی ملاقات—— آنکھیں بند کیے اس نے دو برتھ والے اس کوپے کا تصور کیا،

آسمانی رنگ کی بدن سے چمٹ جانے والی نائلن جارجٹ کی ساری میں لپٹی ہوئی وہ چار سال پہلے سے بھی زیادہ جوان، زیادہ تنی ہوئی، زیادہ پُرکشش اور زیادہ اشتعال انگیز لگی، اس کا بھائی ڈبہ سے اتر کر بک اسٹال پر جا چکا تھا۔

تم——————

اور اگر ایسا ہو سکتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہو لیتا، اس کی کمر میں بانہیں ڈالے،

وہ کھڑکی پر دونوں ہاتھ رکھے باہر دیکھ رہی تھی۔ وہی گردن سے نیچے کا حصہ——بلاؤز کے تنگ گھماؤ سے جھانکتا ہوا وہ حصہ——

وہ آہستہ سے جھکا——————

اس کے سانسوں کی گرمی محسوس کرتے ہوئے وہ اچانک مڑی، معاً اس کا جی چاہا اس کی کمر میں بازو حمائل کر کے.....

اس کی پشت سے مس کرتی ہوئی اس کی بیوی کی پیٹھ کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔

مگر اس کی کمر اس کی گرفت سے باہر تھی کوئی پیارا سا جرم تھا جو اسے روک رہا تھا، اس کام سے روک رہا تھا جو وہ چار سال پہلے کئی بار کر چکا تھا۔

بس! ایک بوسہ، گرم، لرزتا ہوا، تپا ہوا،

چار سال——————

لمحوں کی اس دنیا میں

اس کی بیوی آنکھیں بند کیے اپنی سہیلی کے اس خط کے متعلق سوچ رہی تھی جس میں اس نے خبر کی تھی کہ سجاد کی پوسٹنگ یو۔ان۔او میں ہوگئی ہے اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ بہت جلد جانے والا ہے۔

سجاد اگر اس کا شوہر ہوتا، جیسے ایک جھنجھنی سی سارے رگ و پے میں دوڑ گئی،

یہ کیا ہے؟

ڈاکٹر کی بیوی بن کر اس نے پایا کچھ نہیں، کھویا شاید سب کچھ، یا سجاد کی بیوی نہ بن کر ہی اس نے سب کچھ کھو دیا۔

پانچ فٹ آٹھ انچ کا تندرست اور مسکراتا سجاد—— کالج کے وہ اسکرشن!

اجنتا کے اندر سجاد نے بے حد جذباتی ہو کر اس کے لبوں کو چوم لیا تھا تو وہ چند لمحوں کے لیے پتھر کی مورت بنی وہیں گڑ گئی تھی——————

جنوری کی وہ رات جب وہ دونوں سردی میں ٹھٹھرتے مشاعرے سے واپس آ رہے تھے، سامنے دہرہ دون زمین پر تارے چھٹکے ہوئے آسمان کی طرح لیٹا ہوا تھا، سجاد کا ہاتھ اس کی کمر میں تھا،

''کاش! لمحے تھم جاتے۔''

سجاد نے اُسے قریب کرتے ہوئے کانوں میں کہا۔

اس کا شوہر سو چکا ہے اس نے سوچا۔

''سجاد!''

——————اور بمبئی کے جوہو پر لیٹے ہوئے دونوں نے سمندر کے دوسرے کنارے کو

ڈھونڈنے کی کوشش کی، دوسرا کنارا، جونظر نہیں آرہا تھا۔ لال تھال سا سورج پانی میں جیسے اب چھن سے گرے گا!

''سجاد'' اس نے بہت آہستہ سے پکارا—

''تم نے کچھ کہا——'' سجاد نے ایسی معصوم اور گہری اور ڈوبتی ہوئی نظروں سے دیکھا جیسے اب اس کے بعد معصومیت اور گہرائی کے سارے تصورات مات کھا جائیں گے۔

اِردگرد میلا لگا ہوا تھا، مگر وہ دونوں تنہا تھے، دونوں تنہا تنہا——

وہ سجاد نہیں تھا،

وہ—وہ نہ تھی،

وہ محبت تھی، وہ کشش تھی، وہ پیاس تھی، وہ کھونے کی تمنا تھی، وہ پانے کی کوشش تھی، وہ سمندر کیا تھا؟ وہ سورج کیا تھا؟

وہ کمپارٹمنٹ کی کھڑکی سے ذرا سا اڑی ہوئی کھڑی اس کی اور چپ چاپ دیکھے جا رہی تھی اور اس کے اتار چڑھاؤ اور گولائیوں کے تمام اسرار و رموز چھن چھن کر بکھر رہے تھے اسے لگا اس کی آنکھوں میں وہی جذباتی ہیجان ہے، وہی ابال ہے، وہی جوش ہے اور سب کی تہہ میں دھیمی، سلگتی ہوئی آنچ——جس کے تصور سے ہی اس کی پیشانی پر چند قطرات یوں ابھر آئے جیسے سمندر سے آبخرے اٹھ رہے ہوں۔

''تم وہاں کتنے دنوں میں ایم۔آر۔سی۔جی۔او کرلوگی؟''

''بتانا مشکل ہے!''

سوال وہ نہیں تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

جواب بھی وہ نہیں تھا جو اسے چاہیے تھا۔

''تم نے مجھے کیوں بلایا تھا۔'' یہ سوال اس نے ایسے کیا جیسے اپنے آنے کا جواز تلاش کر رہا ہو۔

یا الفاظ اسے فریب دے رہے تھے، یا وہ سوال جو وہ کرنا چاہتا تھا الفاظ کی گرفت سے باہر تھے، اس کا سوال شاید الفاظ سے شرما رہا تھا۔

''تم اچھے ہو؟'' اتنی دیر بعد اس نے پوچھا۔

''اچھا—؟ ہاں، اچھا ہوں——میں——میں نے سنا ہے تم شادی کر رہی ہو—؟''

اس نے اسے سرتاپا ایک ایسی نظر سے دیکھتے ہوئے پوچھا جس سے محرومیوں کا لاوا ابل رہا تھا۔

جواب—— اُس نے اپنی نظریں اپنے پاؤں پر گاڑ دیں!

''لندن میں کوئی ہے تمھارا؟'' (کاش لندن میں اُس کا کوئی نہ ہو)

''پاپا ان دنوں وہیں ہیں اور میرا چچازاد بھائی—''

آگے سننے کی تاب اُس میں نہ تھی اور شاید آگے کہنے کی تاب بھی اُس میں نہ تھی، معاً اس کا جی چاہا پھوٹ پھوٹ کر روئے، تمھارا وہاں کوئی نہیں، کہیں بھی کوئی نہیں،

میرا کوئی نہیں——

میں بھی نہیں ہوں——

اس نے محسوس کیا کہ سجاد اُس کی بانہہ میں بانہہ ڈالے، نیویارک کی چمکدار روشنیوں سے گزرتی، مخمور و مسحور چل رہی ہے۔ آہستہ آہستہ، اس کے جسم کی حرارت اس کے جسم میں گھسی آ رہی ہے، اس کے جسم کی خوشبو،

تھم جاؤ، لمحو تھم جاؤ!

خوشبو، سجاد ایک خوشبو کی طرح آیا تھا، خوشبو کا بدن کہاں ہے؟

ٹرین کی رفتار سے قدم ملا کر کتنی دور چلا جا سکتا ہے؟

اس کی بیوی اپنے اندر ہی ذرا سی لرزی، اس نے بھی جنبش کی اس کے پیر اس کی بیوی کے ملائم پاؤں پر پڑے۔

وہ مڑی، اس نے بھی پہلو بدلا۔

دونوں اب نیم وا آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے، اس نے بانہہ بڑھا کر اپنی طرف کھینچا اور بھینچ لیا——

ڈارلنگ——!

ڈارلنگ——!

اس کے ہاتھ اس کی گردن سے اترتے ہوئے اس کی پشت پر بریشیر کے ہُک سے کھیلنے لگے،

آگ، لمحات، جذبات اور

——اور کچھ دیر بعد اُس کا منہ اُسی دریچے کی طرف تھا

اور اس کا منہ اس خوبصورت وارڈروب کی طرف

وہ گہری گہری سانسیں لیتا ہوا نیند میں ڈوب گیا۔

وہ نرم نرم مگر گہری سانسیں لیتی ہوئی سوگئی۔

تیسری منزل کے واحد کمرے کی سبزی مائل روشنی ہچکچا ہچکچا کر دریچے سے باہر آنے سے قاصر کمرے میں قید تھی——

(صفر—— کلام حیدری)

روشنی کی ضمانت

میں کس سے مخاطب ہوں؟ کس سے باتیں کر رہا ہوں، کس کو اس داستان کا تحفہ پیش کر رہا ہوں؟—— الفاظ، الفاظ—— تم آؤ، تم یوں سمجھو کہ جو سنے، جو بھی سنے اس کے دل کو لگے یہ اس پر بیتے گی، یا اُس پر بیت چکی ہو، کہ جیسے اُس پر بیت رہی ہو۔

کہ سوٹ میں ملبوس کسی بہت بڑے عہدے دار کی خواب گاہ کے اسرار...

ایسا نہ کرنا.....

کیونکہ ایسا کرنے سے کیا ملے گا؟ کوئی عہدہ نہیں، کوئی ایوارڈ نہیں، کوئی.....

میں کس سے مخاطب ہوں؟ میں کس کی بابت کہنا چاہتا ہوں؟ یہ قلم میرا ہے؟ میرے لیے ہے؟——

میرے لیے ہوتا تو میں اسے جیب میں رکھے رہتا، نکالتا کیوں؟ میں کس شہر کا آدمی ہوں، کس صدی میں رہتا ہوں۔ صدی کس کو کہتے ہیں؟

سوالات کی بوچھار ہے، میں ان کے نرغے میں ہوں اور ان کے ہر وار کو خالی دے رہا ہوں، پھر بھی کبھی نیزے کی اَنی چبھ جاتی ہے، کبھی زہر میں بجھا تیر گڑ جاتا ہے، کبھی.....

اور یہ سب اس لیے ہے کہ میرے پاس سِپر ہوتے ہوئے بھی اُسے استعمال کرنے کا گُر نہیں آتا، سِپر استعمال کرنے کا ہنر جسے نہیں آتا۔ اسے سوالات چھلنی کر دیتے ہیں۔ میں—— میں بھی چھلنی ہو چکا ہوں..... میرا نام.....

میرا نام.....

میرا نام پریاگ ہے!

مگر یہ تو.....

اس پر مت جاؤ کہ میں کس مذہب کے خاندان میں پیدا ہوا ہوں اور اس پر بھی مت جاؤ کہ تم میرا نام جانتے ہو، کیوں کہ تم جو جانتے ہو وہ بتانے کے لیے یہ قلم نہیں ہے، یہ قلم.....

یہ قلم تو میرا ہے بھی نہیں، کبھی میرا نہیں رہا، یہ.....

میرا نام پریاگ ہے.....

میرا باپ.....؟

میرے باپ کا نام گنگو ہے..... اس کی عمر پچاسی سال سے اوپر ہے، وہ اب کوئی کام نہیں کرتا، اس کا ذہن بھی کام نہیں کرتا، اپنی دو کوٹھری کے کچے مکان کے برآمدے میں پڑے کھٹولے پر وہ ہر موسم میں چادر لپیٹے لیٹا رہتا ہے اور الٹی سیدھی سانس لیتا رہتا ہے، شام ہونے سے پہلے اس کے جسم میں جانے کہاں سے طاقت آجاتی ہے، وہ اٹھتا ہے اور مٹی کے تیل کا ایک دیا کھٹولے کے نیچے سے نکالتا ہے، اپنی جیب میں ماچس ٹٹولتا ہے، اور لاٹھی لے کر اس چھوٹے سے گاؤں کی اُس چھوٹی سی اجاڑ، ویران مسجد کے پاس والے بڑے سے پختہ مکان کی طرف چل دیتا ہے جس کا بیشتر حصہ منہدم ہو چکا ہے..... یہ کیوں بچ رہے ہیں؟

میرا باپ کیوں بچ رہا ہے؟

سوالوں کے تیروں سے مجھے مت چھیدو، کہ میں پہلے ہی چھلنی ہو چکا ہوں.....

پریاگ..... جس کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی ہے..... اس سے کچھ سن لو، کہ پھر جب میرا باپ نہ ہوگا تو مجھے یہ سب یاد دلانے والا بھی نہ ہوگا..... اور پھر تم جان ہی نہ پاؤ گے کہ میرا نام پریاگ کس نے رکھا ہے اور میرا باپ پچاسی سال کی عمر میں اچانک شام کو کیسے اٹھ بیٹھتا ہے، کھڑا ہو جاتا ہے اور چلنے لگتا ہے اور.....

موتیابند ہوتے ہوئے بھی وہ کچی گلیوں کی نالیوں سے بچتا بچاتا ٹھیک اُس مسجد کے پاس والے اس بڑے کھنڈر مکان تک کیسے پہنچ جاتا ہے.....! اسے سوائے میرے گھر کے سبھی روکتے ہیں۔

سبھی منع کرتے ہیں، کیوں کہ میرا ایک بھتیجا مجسٹریٹ ہو گیا ہے،

میرا بڑا بیٹا ایم۔ ایل۔ اے ہے—!

ہمارا پختہ مکان اس گاؤں سے ذرہٹ کر بگھا پر بن گیا ہے

دو کوٹھری کے کچے مکان میں.....

سوال؟

چین سے کہہ لینے دو، پھر نہ میرا بیٹا کہہ سکے گا، نہ بھتیجا کہے گا، پریاگ ہی..... صرف پریاگ.....

دِیا لیے ہوئے میرا باپ اس مکان کے بیٹھکے پر پہنچ جاتا ہے اور ماچس جلا کر روشن کرتا ہے.....

وہ دیے کو لے کر بڑے ہال کے بازو والے دونوں کمروں میں جاتا ہے، ایک منٹ دو منٹ وہاں رہتا ہے، پھر روشن دیے کو لے کر ہال میں آ کر دیا ایک طرف رکھ دیتا ہے اور خود بیٹھ جاتا ہے اور ہانپنے لگتا ہے، اُلٹی سیدھی سانسیں لینے لگتا ہے اور.....

سن لو..... کیوں کہ یہ سانس جب ٹوٹ جائے گی تو اتہاس کے ہزاروں پنّے پلٹنے پر بھی تم کو کوئی نہیں بتا سکے گا کہ الٹی سیدھی سانسوں میں میرا باپ کیا بول رہا ہے؟

''دیّا——! ہودیّا—— ہم ہی گنگو!''

کوئی پانچ چھ سال کا بچہ دوڑتا ہوا ڈیوڑھی کے پاس جاتا ہے.....

گنگو آیا ہے..... گنگو آیا ہے

اور، پھر وہ میرے باپ کے کندھے پر چڑھ جاتا ہے.....

پھر وہ گھر کے اندر جاتا ہے.....

بدتمیز، بے ہودہ..... نکالو اس کو..... گنگو کہتا ہے..... گنگو نانا کہو..... کہو گنگو نانا..... لگتا ہے گنگو اس کا نوکر ہے، بدتمیز—نانا کہو—، اور تھپڑ کھا کر وہ بچہ گنگو میں لپٹ جاتا ہے.....

بُت رُو کے مارانا دیّا—اِی تُہرے ناتی نا، ہمر وناتی ہے..... نا مت رو، اِتّا گولڑکن کے مارَل جا ہے دیّا.....

نہیں گنگو..... اس کو کندھا پر مت بیٹھاؤ، اِی پریاگ کا جو نام لیتا ہے ماما نہیں کہتا..... میرے باپ کی دیّا اس بڑے مکان کی مالکن ہے، مکان کا مالک شہر میں ڈاکٹری کرتا ہے، گاؤں میں زمین دار سے الگ خوش حال گھرانہ ہے.....

مگر یہ.....

گنگو نے اپنے گمچھے کے ایک کونے میں بندھا ہوا گُڑ نکالا اور اس بچے کو کھلانے لگا، بچہ چپ

ہو چکا تھا.....

میرے باپ کا دِیا ہال میں روشن ہے، کہ سرِ شام اگر چراغ بتی نہ کی جائے تو مکان میں بھوت اور جنات رہنے لگتے ہیں، اس مکان میں بھوت جنات نہیں رہتے کیوں کہ.....

پھر میرے باپ نے دیے کو اپنی ہتھیلی پر رکھا ہے اور ہال کی سیڑھیوں سے اُتر رہا ہے..... اور ذرا گھوم کر چھوٹی سی مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا ہے.....

وہ مسجد کے دروازے میں داخل نہیں ہوتا۔ ہات بڑھا کر روشن دیا مسجد کے آنگن میں رکھ دیتا ہے اور اندھیرے آسمان کے اوپر مسجد کے گرے ہوئے مینارے کو دیکھتا ہے——

''ہے بھگوان''

اس مسجد میں گنگو کی دیّا سینی میں افطار کا سامان رکھ کر گنگو کو پورے رمضان بھر دیا کرتی تھی اور گنگوا سے موذّن صاحب کے حوالے کر دیتا تھا.....

کون جانے!——

میں پر یاگ کہہ رہا ہوں کہ روزہ افطار کرنے والوں کی دعاؤں میں گنگو کا کتنا حصہ تھا؟

اور.....

گنگو نانا کے کندھوں پر چڑھ چڑھ کر اُس کا ناتی جس کا نام محمد ابوذر یا محمد یٰسین..... کچھ بھی سمجھ لیا جائے، تھا میٹرک پاس کر گیا.....

تو گنگو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں کیا ہوا؟

کچھ ہوا ہوگا؟

سید ٹولی خالی ہوئی'

شیخ واڑہ خالی ہوا'

مَلِک ٹولہ خالی ہوا'

دیّا اپنے مکان میں تھی، دیّا کے بیٹے کہاں چلے گئے؟

گنگو سب کے سامان اسٹیشن پہنچاتا رہا، جیسے کہ وہ کالج بند ہوتے یا آفس میں چھٹی ہوتے پھر

آنے والے ہوں'——

''اِی دیّا بڑی گجب ہو گئیل کہ ایک دم سے لگو ہو بستیا ہو بولے لگ لے ہو——''

دیّا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا، اس کا ڈاکٹر شوہر مر چکا تھا، ڈاکٹر بیٹا——اس کا سامان بھی گنگو نے ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا تھا.....

پر یاگ بیل گاڑی چلا رہا تھا——

کب اَیبھو چھوٹا بابو؟

چھوٹا بابو چپ تھا، وہ کچھ نہیں بولا..... وہ بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کی آواز سنتا رہا، جیسے.....

''دُلہین!'' گنگو کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔

مگر——

گنگو جانتا تھا کہ اُس کو، جانے والی بہو کوئی جواب نہیں دے گی مگر کیوں؟

کئی سال یہ سلسلہ چلتا رہا اور——

مگر کیوں؟ جواب نہیں ملتا گنگو کو؟

گنگو کے جسم و جاں چھلنی ہو گئے تھے، وہ اپنے ہی سوالوں سے زخمی ہوتا رہا——پورا مکان ہائیں ہائیں کرتا اور گنگو سر نیوڑھائے ڈیوڑھی میں بیٹھا رہتا——

دیّا شام کو جانماز سے اٹھتی تو گنگو گھر کے تمام دروازے بند کر کے ڈیوڑھی میں ایک کونے میں ڈھیر ہو کر سو جاتا——

گنگو کو اس صبح ایسا لگا کہ جیسے وہ کئی رات سے نہیں سویا ہے، ایسا کیوں لگ رہا ہے؟ گنگو کی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اٹھا، کھنکارا، کھانسا——

مگر.....

وہ پکارا——

دیّا..... دیّا.....

خاموشی!

ٹُلکنی..... اُس نے دیاّ کی دائی کو آواز دی— ٹُلکنی کے دیر تک سونے کی عادت سے وہ واقف تھا۔
ٹُلکنی کے قدموں کی چاپ اس نے سنی مگر اس کے قدموں میں وہ دھم دھم سی آواز نہ تھی'
گنگو کاکا!
وہ زار و قطار رونے لگی..... دیاّ.....
بستی میں کوئی نہیں تھا.....
وہ جلدی جلدی ڈیوڑھی سے باہر نکلا اور دو میل دور کے ایک گاؤں کی طرف چل دیا، جہاں.....

اور وہاں سے چند عورتیں آئیں اور کچھ مرد آئے اور آگے آگے گنگو تھا اور پیچھے اس کی دیاّ سفید لباس سر سے پاؤں تک اوڑھے ہوئے.....
گنگو میرا باپ ہے؟
وہ اس ٹوٹی ہوئی مسجد کے دروازے پر مرا پڑا ہے—!
دن ہو گیا ہے، مسجد کے صحن میں گنگو کا روشن کیا ہوا دِیا جل رہا ہے—
کہ روشنی کے لیے دن کوئی ضمانت نہیں ہے——

(گولڈن جوبلی: کلام حیدری)

اپنی زندگی کے کچھ سچ

مجھے اپنی تاریخ پیدائش یاد نہیں ہے لیکن مجھے میری ماں نے بتایا ہے کہ میں جولائی ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوا۔ مجھ سے پہلے میری ایک بہن پیدا ہوئی تھی، یعنی میری آپا جو ساڑھے تین سال کی عمر میں، اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کیے بغیر دنیا سے چلی گئی۔ اس کا نام قرۃ العین تھا۔ میں اپنی پیدائش سے لے کر آج تک آپا قرۃ العین کو تلاش کرتا ہوں مگر وہ مجھے آج تک خوابوں کے سوا اور کہیں نہیں ملی۔ میری قرۃ العین آپا! جن کی میں کوئی تصویر نہیں بنا سکتا۔ ہر چند کہ میرا تصور ہمیشہ کچھ آڑی ترچھی لکیریں کھینچتا رہتا ہے۔ لیکن میری آپا قرۃ العین کا کوئی مجسمہ نہیں بن سکا۔ چار پانچ سال کی عمر سے لے کر آج اڑتالیس سال کی عمر تک میرا تصور اپنی آپا کو ڈھونڈ تا رہا ہے، شاید اس اذیت سے مجھے مرنے کے بعد پناہ ملے گی۔

میں نے اپنے نانا کے ساتھ رہ کر پانچ برس کی عمر سے لے کر بارہ سال کی عمر تک تعلیم پائی۔ قصبہ جلیسر کے محلّہ نوشیان کے ہر مکان کی ایک ایک اینٹ مجھے آج تک یاد ہے، اس کا منہدم اور کھنڈر قلعہ بھی مجھے یاد ہے۔ اختر منزل کی وہ بڑی عمارت بھی یاد ہے جو بذات خود ایک محلے کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ کسی بہت بڑے جاگیردار کی ملکیت تھی جس کے احاطوں میں مونگ پھلیاں لگتی تھیں جلیسر گھنگھروؤں کا شہر ہے اور ان گھنگھروؤں کی موسیقی آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

میں اپنی گوالن میاّ کی خوشبو کو بھی نہیں بھول سکتا۔ شیر خوارگی کے زمانے میں میری وہ گوالن میاّ جس کا بیٹا کلدیپ مجھ سے شاید چند دن چھوٹا یا بڑا ہوگا۔ بھی مجھ سے نہیں بھلایا جا سکتا۔

اسکول کے تین چار برسوں میں ماں باپ سے الگ رہ کر گمراہ ہونے اور بھٹکنے کے سارے راستے کھلے رہتے ہیں لیکن نہ جانے ایسا کیوں ہوا کہ میں بھٹکا تو گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ کی بلڈنگ میں پہنچ گیا۔ جہاں افسانوں، ناولوں، داستانوں کی کتابیں اور رسالوں کے فائل سے چُن چُن کر صرف افسانے پڑھتا رہا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شام کو لائبریری اس وقت کھلتی جب میں اس کے برآمدے میں اس کے

کھلنے کا دس دس منٹ، پندرہ پندرہ منٹ تک انتظار کرتا رہتا اور جب لائبریری کا آخری دروازہ بند ہونے لگتا تو باہر چلا آتا۔ اسکول کے ان چار برسوں میں آٹھواں کلاس پٹنہ مسلم ہائی اسکول سے پاس کیا۔ لیکن نویں جماعت میں رام موہن رائے سیمنری میں داخلہ لے لیا، یہ ۴۲ء تھا۔

ابّا مرحوم کی پوسٹنگ اس سے پہلے دانا پور میں تھی جہاں ملٹری کنٹونمنٹ تھا اور چھوٹی چھوٹی چھٹیوں میں بھی وہاں جاتا تو ٹامیوں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں اس وقت کے کچے ذہن میں بھی اپنی غلامی کا شدید احساس ہوتا۔ دانا پور اسٹیشن پر آنے جانے والی گاڑی کے ڈبوں پر For Europians only لکھا ہوا دیکھتا تو مایوس کن سی اضمحلالی کیفیت طاری ہوجاتی۔ کھگول ریلوے انگریزی فلمیں دکھائی جاتی تھیں، اس سنیما ہال میں بھی انگریزوں کے لیے ایک الگ مخصوص کلاس تھا جس میں بیٹھنے کی مجھے خواہ مخواہ خواہش ہوتی۔ میں نے نشے میں چور ٹامیوں کو ٹم ٹم سے لڑھک کر گرتے دیکھا، دانا پور (کھگول) کی ریلوے کالونی کا لان اور اس کی چمن آرائی اس وقت دیکھنے کے لائق ہوا کرتی تھی۔ وہاں میرا ایک دوست تھا منظور عالم، جس کے یہاں رسالوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ کیونکہ اس کے چچا ''خیام'' وغیرہ میں افسانے لکھا کرتے تھے۔ رحمت علی، صابر نور محلوی لاہور سے نکلنے والے مقبول ماہناموں اور ہفتہ واروں میں کثرت سے چھپتے تھے۔ منظور عالم اور میں ریلوے کالونی کے لان، اس کے فواروں اور اس کی چمن آرائیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے شام کو وہاں ضرور جاتے اور ڈی ایس دانا پور آفس کے اردگرد لان میں بیٹھی اینگلو انڈین عورتوں اور لڑکیوں کو اس طرح دیکھتے کہ جیسے وہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہوں۔ یا کسی Fairy Land سے ابھی ابھی اتر کر آئی ہوں۔ اپنی غلامی کا شدید مگر کچّا احساس اس ماحول میں جانے کدھر سے جڑ پکڑتا رہا۔

یہاں تک کہ اچانک ۱۹۴۲ء میں، جمعہ کا دن تھا۔ الفسٹن سنیما پٹنہ میں فضلی برادران کی فلم ''چورنگی'' کا میٹنی شو ہو رہا تھا کہ انقلابیوں کا وہ جلوس سنیما ہاؤس پر ٹوٹ پڑا، جس جلوس پر پٹنہ سکریٹریٹ کے پاس فائرنگ ہوئی تھی اور کئی نوجوان شہید ہوئے تھے۔ فلم بند ہوگئی۔ الفسٹن سنیما ہاؤس کے سب دروازے کھل گئے تھے اور ہاتھ میں تین رنگے جھنڈے لیے ہوئے لوگ ہال میں داخل ہوگئے۔ پتہ نہیں کیسے ایک جھنڈا میرے ہاتھ لگ گیا اور اسے لیے جب میں ہال کے باہر انقلاب زندہ باد کے نعروں کے درمیان نکلا تو اس وقت تک پورے پٹنے پر ٹامیوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ بی این کالج کے پاس انھوں نے ایک

بیریر بنا دیا تھا۔ ایسے بیریر شاید شہر کے مختلف حصوں میں بنائے گئے تھے۔ مجھے پوربی پٹنے کی طرف جانا تھا۔ اس لیے میں نے اس بیریر کو پار کرنا چاہا تو ایک ٹامی نے مجھ سے پوچھا ''گاندھی والا یا جناح والا''۔ مجھے گاندھی اور جناح کا فرق معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا ''جناح والا'' اس نے مجھے پار جانے دیا اور گاندھی والوں کو نہ صرف یہ کہ پکڑ لیا بلکہ بے تحاشا ان کو مارنا شروع کیا۔ جب تک اپنے کمرے پر نہیں پہنچا۔ اس وقت تک راستہ بھر یہ سوچتا رہا کہ گاندھی اور جناح میں کیا فرق تھا کہ اس نے جناح والے کو چھوڑ دیا اور گاندھی والے کو پکڑ لیا۔ کمرے میں پہنچ کر مجھے اس فرق کا پتہ چل گیا اور میں نے محسوس کیا کہ میں جناح والا نہیں ہوں، گاندھی والا ہوں۔

دوسرے دن رام موہن رائے سیمنری کے دونوں گیٹوں پر طلبا کا بڑا سا جلوس تھا اور گیٹ بند تھے تو میں نے گیٹ کے ایک تالے کو ایک بڑے سے پتھر سے مار مار کر توڑ دیا۔ گیٹ کھلتے ہی آگے آگے تھا اور میرے پیچھے ہزاروں غلامی سے نجات پانے کے لیے بے قرار لوگ تھے۔

چند دنوں کی ہل چل کے بعد بے شمار جیلوں میں تھے اور پٹنہ کے ہر کالج کے میدانوں میں ٹامیوں کی فوج مشین گنوں اور رائفلوں سے مسلح پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی۔ پٹنہ سے ہر جگہ جانے کے راستے مسدود تھے۔ کئی دنوں بعد اسٹیشن سے ایک بس ملی تو اس سے میں بہار شریف پہنچا۔ بہار شریف سے ایک ٹم ٹم پر بر بگہا کے لیے روانہ ہوا تو ایک ہی میل پر ٹم ٹم کا ایک چکّا نکل گیا۔ ٹم ٹم کی سواریاں سڑک پر لڑھک گئیں۔ ان میں، میں اور میرے ایک خالہ زاد بھائی تھے۔ وہاں سے آٹھ میل پیدل چل کر ہم دونوں مَلِک چک پہنچے۔ جہاں میری خالہ کا گھر تھا۔

میری یہ خالہ اردو اور فارسی کے علاوہ تاریخ پر اتنا عبور رکھتی تھیں کہ وہ آئی اے اور بی اے تک کے گھر کے طالب علموں کو فارسی پڑھاتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم میں انگریزوں سے انتہائی نفرت کی بنا پر ہٹلر سے انھیں اتنی محبت اور اتنی عقیدت تھی کہ وہ ہر لحہ ہٹلر کی اقبال مندی کی دعائیں مانگا کرتی تھیں اور چھوٹے بڑے تمام محاذوں کی جو اطلاعات ان تک اخباروں سے پہنچتی تھیں، وہ انھیں اس طرح یاد تھیں کہ جیسے وہ ہر چھوٹے بڑے محاذ کی ہر جنگ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔

یہ میری وہ خالہ تھیں جن کے علم کا دبدبہ میرے اوپر بہت زیادہ تھا اور جن کے یہاں میں نے

اپنی اُس آپا کا بدل تلاش کر لیا تھا جو میرے پیدا ہونے سے پہلے دنیا سے جا چکی تھی۔شاہدہ باجی کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے مجھے اپنے بھائیوں کے زمرے سے ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہیں سمجھا۔ دیکھنے میں مضبوط، تنومند اور بے حد خوبصورت، میری شاہدہ باجی نے میری قرۃ العین آپا کی جگہ لے لی تھی۔ میری آمد کی مسرت سے وہ ایسی کِھل اٹھتیں کہ جیسے انھیں بڑی نعمت مل گئی ہو اور باورچی خانے میں بے انتہا مصروف ہو جاتیں، انھیں معلوم تھا کہ میں کون کون سی چیزیں پسند کرتا ہوں، انھیں معلوم تھا کہ میں کن باتوں سے دُکھی ہوتا ہوں۔

شاہدہ باجی کی جب شادی ہوئی تو مجھے یاد ہے، کسی لمحے رویا نہیں، اور اس سے زیادہ خوشی مجھے اپنی چھوٹی بہن عفیفہ کی شادی میں بھی نہیں ہوئی۔ان کے شوہر عبدالقیوم ملک، اپنے وقت کے بہار کے نامی گرامی فٹ بال پلیر رہے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد ان کو پاکستان جانا پڑا۔ میری شادی کے موقع پر جب شاہدہ باجی ۱۹۵۵ء میں بڑے دھوم دھام سے خاص طور سے پاکستان سے آئیں تو میں رو پڑا۔ سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش کی تمام المناکیوں کو میری بہن وہاں جھیلتی رہی اور میں یہاں تڑپتا رہا اور جب اپنی پیاری بچیوں اور لڑکوں سمیت کراچی پہنچ گئیں تو مجھے لگا میں نے دوسری زندگی پائی۔ میری قرۃ العین آپا کو خدا نے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ کیونکہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کی مصلحتیں انسانی عقل سے بالا ہیں۔لیکن میری شاہدہ باجی کو ملک کی تقسیم نے چھین لیا۔اس کا مجھے اتنا دُکھ ہے جس کا پرتو میری کئی کہانیوں میں اس طرح آیا ہے کوئی دل والا روئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اگست ۴۲ء کے بعد جب نومبر ۴۲ء میں حالات نارمل ہوئے اور میں واپس پٹنہ گیا تو مجھے معلوم ہوا کہ رام موہن رائے سیمنری سے مجھے نکال دیا گیا ہے۔ میں نے پرائیویٹ مسلم ہائی اسکول سے نویں درجے کا امتحان پاس کیا اور میں دسویں درجے میں نام لکھا لیا۔

دسویں اور گیارہویں کے بہترین دوستوں میں یوں تو بہت سے نام ذہن میں رینگ آتے ہیں لیکن حافظ علی رضا جیسا مخلص ساتھی اور دوست مجھے کوئی نہیں ملا۔ حافظ علی رضا لندن میں عرصۂ دراز سے اپنی جرمن بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش خرم ہے۔ چند سال پیشتر جب حافظ علی رضا گیا آیا تو یہ سو فیصد وہی حافظ علی رضا تھا، جو اسکول میں میرا ساتھی، ہمدرد اور دوست رہا تھا۔لندن میں اس کے کئی مکانات ہیں۔

خود کا وُسٹ اکاؤنٹنٹ ہے اور لندن میں بھی اپنی مہمان نوازی اور دوستی کے سلسلے کو اسی طرح برقرار رکھے ہوئے ہے جس طرح پٹنہ کے رمنہ روڈ کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رکھتا تھا۔ حالانکہ حافظ علی رضا ایک غریب طالب علم تھا اور آج وہ ایک بے حد خوش حال لندن کا باشی ہونے کے باوجود مزاجاً، عادتاً اور طبیعتاً وہی ۴۴-۱۹۴۳ء اور ۴۵ء کا حافظ علی رضا ہے۔

میٹرک پاس کر لینے کے بعد میں نے کلکتے کا رخ کیا اور وہاں ایک نائٹ کالج میں کامرس پڑھنے لگا۔ یہ ۱۹۴۵ء کا اگست یا ستمبر کا مہینہ تھا۔کلکتہ میں میرا کوئی نہیں تھا۔ سوائے ایک دوست کے جس کا نام ریاض تھا اور جو سول سپلائز کے محکمے میں ملازم تھا۔اس نے مجھ خط لکھ کر کلکتے بلایا اور میں دو سال تک اس کے ساتھ اس طرح رہا کہ حسابِ دوستاں دل سے باہر کبھی نہیں ہوا۔

۱۹۴۲ء میں کلکتے میں مسلم لیگ کے ڈائریکٹ ایکشن کے نتیجے میں جو بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا۔اسے میں نے اتنے قریب سے دیکھا ہے کہ میں فرقہ وارانہ فساد کی المناکیوں کے تمام پہلوؤں کو لیے ہوئے ایک ایسا دکھی انسان ہوں جس کی سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ مذہبی جنون آدمی کو درندہ کیسے بنا دیتا ہے۔اس فرقہ وارانہ فساد کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے اس لیے ملا کہ میں نے ریڈ کراس میں اپنا نام لکھا لیا تھا اور رائفل پولیس کے ساتھ سڑکوں پر پورے کلکتے کے چھوٹے بڑے محلوں، گلیوں، بازاروں، تنگ مکانوں میں، زندگی سے بیزار بچے کھچے لوگوں کو رفیوجی کیمپ میں لانے کا کام کرتا تھا۔ میں مشکل سے دو ہفتے ریڈ کراس کے ان کاموں میں رہا لیکن ان پندرہ دنوں کا ایک ایک لمحہ داستان بن سکتا ہے۔ پہلے دن جب ہم ٹرک لے کر نکلے تھے تو سڑکوں پر لاشوں کو کھینچ کھینچ کر سڑک کے کنارے کر کے ٹرک کے گزرنے کا راستہ بنانا پڑتا تھا۔

بہار کے فرقہ وارانہ فساد کے بعد مسلم لیگ کے زیر اہتمام جو رفیوجی کیمپ بنے تھے ان کا احوال یہ تھا کہ رفیوجیوں میں کھچڑیاں بٹتی تھیں اور مسلم لیگی لیڈروں کے قائدین اسی بلڈنگ کی اوپری منزل پر پلاؤ اور قورمے تناول فرماتے تھے، بے کس اور بے سہارا جوان لڑکیوں کو سہارا دینے کا لالچ دے کر کتنے ہی بوالہوسوں نے اپنی ہوس پوری کی۔ کبھی موقع ملا تو ان المیوں کو لکھ کر اپنے دل اور ذہن کا بوجھ ہلکا کر دوں گا۔

۱۹۴۷ء میں کلکتے سے آئی کام پاس کرنے کے بعد میں نے سینٹ زیویرس کالج کے تھرڈ

ایئر کامرس میں داخلہ لیا اور ان ہی دنوں میں نے ایک ماہنامہ ''نغمہ ونور'' کے نام سے نکالا اور نکالتا رہا۔ پر ایک دن میرا دوست جس کے ساتھ میں یہ رسالہ نکالتا تھا میرے کچھ حساب کتاب پوچھنے پر یہ کہہ گیا کہ ڈکلریشن اس کے نام سے ہے اس لیے قانونی طور پر وہ رسالہ اسی کا ہے۔ میں نے یہ سننے کے بعد ایک رکشے پر اپنا سامان رکھا اور کلکتے کے ایک کھولا باڑی میں جا کر رہنے لگا۔ رسالہ بند ہو گیا اور میرا وہ دوست کراچی چلا گیا۔ سنا ہے وہاں وہ کوئی تیسرے درجے کا رسالہ نکالتا ہے اور کبھی کبھی فلموں کے گانے لکھتا ہے۔ خدا اسے خوش رکھے۔

ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب مشرقی پاکستان جانے کے لیے کسی اجازت نامے اور پرمٹ کی ضرورت نہیں تھی اور میں سمجھتا تھا کہ دونوں ممالک برابر اسی طرح رہیں گے، میں اکیلے رنگ پور چلا گیا اور اسٹیشن کے ٹھیک سامنے مشرقی بنگال کے قاعدے سے بانس کی دیواروں اور پھوس کی چھاؤنی کے ساتھ ایک ریستوران کھولا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ رنگ پور ااسٹیشن کے اسٹیشن ماسٹر میرے ریستوران میں آئے اور مجھ سے پوچھا کہ'' آپ انگریزی پڑھے ہوئے ہیں؟'' میں نے انھیں بتایا کہ ''میں آئی۔ کام پاس ہوں۔'' پھر یہ پوچھا کہ'' یہ پوچھنے کی آپ کو ضرورت کیا پڑی'' کہنے لگے۔ ''میں روز آپ کو دیکھتا ہوں کہ آپ بک اسٹال سے انگریزی اخبار خریدتے ہیں اور اپنے ریستوران میں بیٹھے ہوئے پڑھتے رہتے ہیں تو مجھے تعجب ہوا کہ آپ کے اغل بغل اور آگے پیچھے، جو دکانیں، ہوٹل اور ریستوران دیگر رفیوجیوں نے کھول رکھے ہیں ان میں اور آپ میں فرق ہے۔''

میں نے رنگ پور کالج میں داخلہ لینا چاہا تو معلوم ہوا کہ کالج بالکل بند ہے اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں نوّے فیصد پروفیسر ہندو تھے جو سب کے سب بھاگ گئے یا بھگا دیے گئے۔ ریستوران کی آمدنی اچھی خاصی تھی مگر باورچیوں کے نخروں اور ملازموں کی شرارتوں نے مجھے عاجز کر دیا تھا۔ وہاں ایک پشاوری خان تھے جن کا سنیما ہاؤس تھا۔ وہاں میرے ایک رشتے کے بھائی چیف آپریٹر تھے۔ میں نے اس سنیما میں سنیما آپریٹری سیکھنا شروع کر دیا۔ پشاوری خان صاحب کو پتہ نہیں میری سنجیدہ خدمت گزاریوں نے کیسے متاثر کر دیا کہ انھوں نے مجھے سنیما کا منیجر بنا دیا اور مجھے ایسا لگا کہ شاید میرا مستقبل رنگ پور ہی سے منسلک ہو گیا۔ خان صاحب کی مہربانیاں اور ان کی عزت افزائی برابر یاد آتی ہے۔

لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں نے اخباروں میں پڑھا کہ ہندوستان اور پاکستان میں آنے جانے کے لیے پرمٹ سسٹم جاری کیا جا رہا ہے۔ میرے اندر کا خالص ہندوستانی اپنی شہریت کو بدلنے پر رضامند نہیں ہوا اور میں نے اچانک رنگ پور چھوڑ دیا۔ میں سیدھا اپنے ابّا مرحوم کے پاس جن کی پوسٹنگ ان دنوں رانچی تھی، پہنچ گیا۔ رانچی میں میں نے تھرڈ ایئر آرٹس میں داخلہ لیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں کو قریب سے دیکھنے کے بعد جب کہ میرا ذہن سیاسی طور پر کوئی راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میری ملاقات اختر پیامؔی سے ہو گئی جس کی نظمیں ان دنوں ''نیا زمانہ'' میں چھپا کرتی تھیں۔ یہ ۱۹۴۸ء تھا۔

لکھنے لکھانے کا سلسلہ کلکتے سے شروع ہو چکا تھا۔ مگر میں نے بغیر فرمائش کے اپنے افسانے لے کر ایڈیٹروں کے پاس دوڑنے اور خوشامد کرنے کو اپنے مزاج کے خلاف پایا۔ فضل حق قریشی کے زمانے کے غیر منقسم ہندوستان کے'' آج کل'' میں میرے کئی افسانے نقلی ناموں سے شائع ہوئے۔ ''جدید اردو'' کلکتے میں پہلی بار میرا افسانہ ''بھابی'' شریکِ اشاعت ہوا۔ رانچی کالج کے ماحول نے مجھے بڑی تیزی کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنّفین، اسٹوڈنٹ فیڈریشن اور یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی سے قریب کر دیا۔ رانچی میں بعض کم جاننے والے لوگ اختر پیامی کو کلام حیدری اور کلام حیدری کو اختر پیامی سمجھتے اور کہتے تھے۔

میرے والد کا انسپکٹر کا کوارٹر، کمیونسٹ پارٹی کے انڈر گراؤنڈ کامریڈس کے چھپنے کی محفوظ جگہ سمجھی جاتی تھی۔ رانچی کالج کے دو سال میں ہم نے اتنے کام کیے کہ لگتا ہے جیسے ہم نے وہاں دس سال کام کیا۔

بی اے ٹسٹ کا امتحان چھوڑ کر میں اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ایک جلسے میں رانچی ڈیلی گیٹس کے لیڈر کی حیثیت سے پٹنے میں صوبائی کانفرنس میں شریک ہوا، جلوس نکالا۔ جلوس پر لاٹھیاں چلیں، میرے دوست گھائل ہوئے۔ قید ہوئے۔ دوسرے دن ہم نے پٹنہ جیل پر نہایت قلیل تعداد میں دھاوا بولا۔ وہاں فائرنگ ہوئی۔ وہاں سے رانچی لوٹا تو اپنے پچھلے امتحانات کے ریکارڈس کی بنا پر بی اے کا یونیورسٹی امتحان دینے کی اجازت ملی۔ جس دن یونیورسٹی کا فارم بھرا وہ تاریخ ۲۴ر جنوری ۱۹۵۰ء تھی۔ ۲۴ر اور ۲۵ر جنوری ۱۹۵۰ء کی درمیانی رات میں تین بجے باہری دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اپنے آپ کو پولیس کی حراست میں پایا۔ رانچی جیل میں مجھے اور میرے ساتھیوں کو جو اس رات گرفتار ہوئے تھے سیاسی قیدی بنا کر نہیں رکھا گیا بلکہ سیل میں بند کر کے رکھا گیا۔

۲۶ رجنوری جب کہ ہندوستان میں جمہوریت کے قیام کا اعلان کیا گیا تو مجھ جیسے محبّ وطن جیل کی سیل میں بند تھے۔ ہم نے ہندوستان میں جمہوریت کے پہلے دن کے اس سورج کو نکلتے ہوئے نہیں دیکھا جس کے لیے ۱۹۴۲ء میں ایک نویں کلاس کے لڑکے نے اسکول کا گیٹ توڑا—— جس کے لیے ۱۹۴۶ء میں جہازیوں نے بغاوت کی—— جس کے لیے پٹنہ سکریٹریٹ کے پاس نوجوان ٹامیوں کی سنگینوں کے آگے اپنے سینے سپر کردیے تھے۔ درمیان میں ایک بات رہی جاتی ہے کہ ۱۹۴۹ء کی انجمن ترقی پسند مصنّفین کی آل انڈیا کانفرنس بھیمڑی میں رانچی سے دو مندوبین نے شرکت کی۔ ایک میں اور دوسرا وحید الحسن جو اس وقت فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور ان دنوں مشہور اینتھر ولولوجسٹ ہے۔

جیل سے چھوٹا تو بی اے کے امتحان کو شاید دس بارہ روز رہ گئے تھے۔ امتحان اور خدا جانے کیسے اردو میں فرسٹ کلاس آنرز کے ساتھ یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن لاکر پاس ہوگیا۔ ان دنوں بہار میں صرف ایک یونیورسٹی، پٹنہ یونیورسٹی تھی۔

ستمبر ۱۹۵۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی میں اردو ایم۔ اے میں داخلہ لیا جہاں میری ہی طرح آزاد ہندوستان کی جیل میں رہ کر آئے ہوئے منظر شہاب بھی تھے۔ منظر شہاب میرے ان چند دوستوں میں سے ہے جس نے دوست ہونے کا نام کبھی نہیں لیا مگر زندگی کے ہر قدم پر دوست رہا۔ انور عظیم بھی دوستوں میں رہے مگر ان کی دوستی کا مزاج اور معیار الگ ہے۔ وہ بھی مجھے عزیز ہے، وہ میرا ساتھی ہے۔ ایم اے میں ہم تینوں نے ایک ساتھ امتحان دیا۔ میرے لیے کسی کا فرسٹ ہونا کسی کا سیکنڈ ہونا، کسی کا تھرڈ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا مگر شاید انور عظیم کے ذہن میں یہ بات پختہ تھی کہ ایم اے میں وہ ٹاپ کریں گے۔ ہم ایم اے کا امتحان دے کر الگ ہوگئے۔ اور جب ایم اے کا رزلٹ نکلا تو میں فرسٹ کلاس فرسٹ تھا۔ انور عظیم فرسٹ کلاس سیکنڈ اور منظر شہاب فرسٹ کلاس تھرڈ۔ حالانکہ شاید ہم دونوں سے زیادہ مستحق فرسٹ کلاس فرسٹ کا منظر شہاب تھا۔ مگر وہ شاعر اور فلسفی، امتحان گاہ میں بھی اپنی شاعری اور فلسفے میں الجھ کر رہ جاتا تھا۔ اس لیے کوئی جواب طویل اور کوئی جواب مختصر، اور کسی سوال کا جواب ہی ندارد، یہ تھا منظر شہاب جو جمشید پور کے ایک بڑے کالج کا آج پرنسپل ہے۔

میں نے اکتوبر ۱۹۵۲ء میں، پورنیہ کالج میں اردو کے لکچرر کی حیثیت سے جوائن کیا اور ۱۹۵۸ء

تک وہاں لکچرر رہا۔ اسی درمیان میری شادی ہوگئی۔ گمان یہ نہیں تھا کہ درس وتدریس کی دنیا سے نکل کر میں کاروبار اور صنعت کی دنیا میں آجاؤں گا، پر ایسا ہوا۔ کلکتے کے ماحول، ریستوران کے تجربے، سنیما کی منیجری، ان سب نے مل کر میرے ذہن پر کچھ ایسا اثر ضرور ڈالا تھا کہ میں کاروبار کی جانب راغب ہوسکتا تھا، شادی ہونا ایک اہم بات تھی کیونکہ یہاں سے زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے مگر یہ نیا باب میری زندگی میں جس طرح شروع ہوا اسے بیان کرنے کا ابھی موقع نہیں ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ سناتا چلوں کہ ایک بار کوئی صاحب جوادیبوں کا انٹرویو لیتے پھر رہے تھے میرے پاس تشریف لائے اور انھوں نے مجھ سے پہلا سوال کیا ''کیا آپ نے اپنی شادی میں ایک لاکھ روپے لیے تھے؟''

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ''آپ کو غلط اطلاع ملی ہے، میں نے اپنی شادی میں ایک لاکھ نہیں، سات لاکھ روپے لیے تھے۔''

خیریت ہوئی کہ انھوں نے اس کی تفصیل نہیں پوچھی ورنہ بتاتا کہ ایک لاکھ کی میری بیوی ہے، ایک ایک لاکھ کی میری تین عدد سالیاں ہیں، ایک لاکھ کے میرے ڈاکٹر ابّا ہیں (سسر)۔ ایک لاکھ کی میری ممی (ساس) اور ایک لاکھ کے میرے بڑے سالے ڈاکٹر خالد خیر ہیں اور یہ ساتوں لاکھ میرے لیے ہر سال ضرب ہوتے چلے جاتے ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ شادی کے بعد سے اب تک ارب اور کھرب پتی ہوگیا ہوں۔

ڈاکٹر ابوالخیر مرحوم کا مارکیٹ ویلیو یہ تھا کہ وہ گیا ضلع کے مشہور ترین ڈاکٹر تھے جو اگر چاہتے تو اپنی شہرت کے ذریعہ جانے کتنا کماتے۔ ان کی قناعت پسندی نے ان سے اتنی مفت دوائیں بٹوائیں، اتنے گھرانوں کو فائدے پہنچائے کہ ان پر سے کروڑوں روپے نچھاور کردیے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر ابوالخیر نے اپنے رشتہ داروں، گاؤں والوں، دوستوں، یاروں کو اتنا کچھ دیا کہ گیا شہر کا کوئی آدمی آج تک انھیں نہ فراموش کرسکا اور شاید فراموش کر بھی نہیں سکتا۔

عجیب بات ہے کہ نانا ابّا مرحوم کے بعد اگر مجھے ان جیسی شخصیت کوئی ملی تو وہ ڈاکٹر ابّا ہی کی شخصیت تھی۔ وہی پاک بازی، وہی پاک طینتی، وہی فراخ دلی، وہی فیاضی، وہی قناعت پسندی، وہی محنت

سے محبت، وہی روشن دماغی، وہی دلیری، وہی بُردباری اور ان سب میں سے کسی طرح کم انکساری نہیں! یہ ان کی جرأت مندی تھی کہ انھوں نے مجھے نسبتاً اچھی ملازمت سے استعفیٰ دے دینے کی حوصلہ مندی بخشی اور میں بے خطر ایک صنعت کار بن گیا۔ ان کی دور رسی، مردم شناسی نے پتہ نہیں مجھ میں کیا پایا کہ میرا انتخاب صنعت کار کے لیے کیا اور میں نے کالج سے دو سال کی چھٹی لے کر ۱۹۵۶ء میں کنکریٹ پائپ بنانے کا کارخانہ اس وقت کھولا جب بہار میں صرف تین کارخانے تھے۔ ڈاکٹر ابّا کے انتقال کے بعد مجھے ایسا لگا کہ جیسے تیز دوپہر میں اچانک رات ہوگئی ہے کہ میرے اندر جرأت مندی ختم ہوگئی۔

۱۹۵۸ء میں، میں نے کالج سے استعفیٰ دے دیا جب تک میرا کارخانہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا۔ میں ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۶۲ء تک اپنی صنعتی مصروفیات میں مشغول رہا اور ادبی طور پر سوائے پڑھنے کے تقریباً کوئی ادبی کام نہیں کیا۔

میری سالی نزہت منصور نے امریکہ سے Educational Psychology میں ایم اے کیا۔ نزہت نوری کے نام سے افسانے لکھتی ہے۔ اس کی زبان، اس کے اپنے حسن کے مطابق ہے۔ میری دوسری سالی قیصر احمد بی اے آنرز ہے، جس نے کبھی کوئی ادبی مقالہ لکھا تو تعریفوں کے ڈھیر لگ گئے۔ میری تیسری سالی نوشابہ حق ڈبل ایم اے ہے اور تاریخ میں فرسٹ کلاس فرسٹ ہے۔ اس کے ساتھ میرا پیار ویسا ہی ہے جیسے گود میں کھلائے ہوئے بچے کے ساتھ اور شاید اس کا پیار ایسا ہے جیسے وہ اپنے حیدر بھائی کے بغیر اپنے آپ کو نامکمل سمجھتی ہے۔ میری ممّی کا یہ عالم ہے کہ جیسے ان کا ایک بیٹا نہیں ہے بلکہ دو بیٹے ہیں اور مجھے یہ شرمساری ہے کہ میں ان کی محبت کے آگے سوائے سرنگوں رہنے کے اور کوئی خراج پیش نہیں کر سکتا۔

اپنی بیوی کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں جیسے اپنی تعریف خود کرنے لگ جاؤں۔ زندگی میں شعلوں سے لہلہاتی راہوں پر چلنے کی صلاحیت مجھ میں اس لیے آج تک ہے کہ اس کے پھول سے ہاتھ میرے شانوں پر ہیں۔

۱۹۶۳ء سے میں نے ہفتہ وار ''مورچہ'' کا آغاز کیا اور ادبی و تہذیبی دنیا میں اسے جو وقار حاصل ہے اسے بتانے کی میری ضرورت نہیں۔ اس کے دو تین سال بعد میں نے ادبی ماہنامہ ''آہنگ'' جاری

کیا۔ اس کی بابت بھی میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کی بابت سب کچھ کہنے کا حق مجھ سے زیادہ اس کے قارئین کو ہے۔

کلچرل اکیڈمی کا قیام بھی ''مورچہ'' کے ساتھ ہی ساتھ وجود میں آیا جس کے نقوش بعد میں ابھرتے چلے گئے اور جس ادارے نے کلیم الدین احمد، اور خلیل الرحمٰن اعظمی جیسے ادیبوں کی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل کیا۔

۱۹۷۱ء میری زندگی کا وہ موڑ ہے جب میرے کیریئر میں بحران آیا۔ ایک زلزلہ— ایک قیامت—— اور اگر اس کا الزام میں کسی کے سر دوں تو میری جان نکلنے لگتی ہے مگر ۱۹۷۱ء کے بعد سے وہ صنعت کار کلام حیدری نیم جاں ہو گیا جو ۱۹۷۱ء سے پہلے کم از کم گیا کے پیمانے پر اپنی ایک مخصوص جگہ رکھتا تھا۔

شاید خدا نے مجھے یہ سبق دیا کہ ادب میرا منتظر ہے اور اگر میں اپنی بقیہ زندگی میں ادب کو کچھ نہیں دے سکا تو میری زندگی کا اصلی مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس لیے میں اپنے آپ کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور ادب میں ڈوب جانا چاہتا ہوں۔

شاہدہ حیدری جب میرے بچے کو جنم دینے والی تھی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے پروردگار سے یہ دعا کی تھی کہ تو مجھے بیٹی دینا اور میری دعا اس طرح قبول ہوئی کہ میری ایک ہی بیٹی ہے مگر جو میری طمانیت کے لیے کافی ہے۔ اس نے میری زندگی میں جو گل بوٹے کھِلائے ہیں ان سے میرے گھر کے در و دیوار، میرے گھر کا ہر کونا معطر ہو گیا ہے۔

(گولڈن جوبلی— کلام حیدری)

اداریے

[1]

ہم شاید اپنی زندگی میں افراط وتفریط اور عجلت پسندی کے علاوہ نمائش کے عادی ہوگئے ہیں اور توازن، سنجیدگی، وقار اور ٹھہراؤ کی اہمیت اور ضرورت سے بے گانہ نظر آتے ہیں۔ پل میں ادب کی تخلیق ہوجائے اس کا معیار بن جائے، اس کا رُتبہ اور درجہ متعین ہوجائے، پل میں عظمت وشہرت کا بلندیوں تک پہنچ جائے— حالانکہ بے صبری و بے تابی سے بنتا کچھ نہیں ہے۔

ادب کسی فیکٹری کا پروجیکٹ نہیں کہ اس پر کسی ٹیسٹ ہاؤس کی مہر لگ جانے سے معیار کی سندمل گئی اور اس کے بعد بازار میں اس کے معیار پر شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ٹھپہ لگانے کی بدعت سے ٹھپّہ دیکھ کر ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے کی بدعت پیدا ہوئی ہے۔ یہ کام صنعتی ڈھنگ سے شروع کرنے اور اسے عروج تک پہنچانے کا کریڈٹ ترقی پسند مصنّفین کے مہنتوں اور قاضیوں کے سر ہے۔ کسی شاعر، اخبار نویس اور نقاد کے تخلیق وتحریر پسِ پشت رہی۔ اس کی پیشانی پر مہر کی تلاش پہلے ہوتی تھی، اگر وہ مہر لگی ہوئی ہے تو اس کی عظمت مسلّم اور ادب میں اس کی جگہ مستقل— اگر نہیں ہے، تو وہ غیر معیاری اور مہمل!

اس ٹھپّہ ماری کے عہد میں کتنے ہی ہونہار نئے ذہن برباد ہوگئے جو پھر ادب کی طرف پلٹے ہی نہیں۔

ترقی پسند مصنّفین کی تحریک نے ہندستانی ادب کو بہت کچھ دیا۔ اس کی دین سے انکار کور بینی اور تعصب ہے، لیکن اس تحریک میں چند مہنت اور قاضی تھے، جنھوں نے ایک دوسرے کو اس منصب پر فائز کرلیا تھا اور یہ تخلیق وہ خالق پر مہریں لگایا کرتے تھے۔ آخر ان ہی قاضیوں نے اسے دفن بھی کیا۔

جدید ادب کو سب سے بڑا خطرہ ٹھپّہ لگانے والی بدعت سے لاحق ہے، جدید ادب کی نئی نئی آزاد مملکت میں بھی مہنت اور قاضی پیدا ہوگئے تو یہ اسے بھی رُسوا کریں گے۔

ترقی پسند مصنّفین ایک تنظیم تھی۔ اس میں کسی قدر ڈسپلن اور ضبط بھی تھا، مگر جدید ادب کوئی تنظیم نہیں ہے، اس لیے اس کو مہنتوں سے زیادہ ہی خطرہ ہے۔

(اگست ۱۹۷۰ء)

[2]

اردو کا ادبی ماہنامہ نکالنا اور نکالتے رہنا کٹھن کام ہے، اس میں دو رائیں نہیں ہوسکتیں مگر تفصیل میں جائیے تو اس کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے کہ ادبی رسائل کا بازار سرد ہے، لوگ بدذوق ہوگئے ہیں، اردو پڑھنے والے تعداد کے لحاظ سے کم ہوتے جارہے ہیں، اس لیے کہ اگر صرف یہی ایک وجہ ہوتی، تو آج سے بیس پچیس تیس سال قبل شائع ہونے والے اردو رسائل کی تعداد اشاعت ہزاروں ہوتی۔ کیا زمانہ نگار، ساقی، نیرنگ خیال، نظام، جدید اردو، سہیل، ندیم، معاصر، چمنستان، تہذیب اور اس طرح کے دوسرے پُرانے رسالوں کی تعدادِ اشاعت آج کے ادبی رسائل سے بہت زیادہ تھی۔ ان رسائل کے اوراق اُلٹیے تو لوگوں کی بدذوقی، قدردانی کی کمی وغیرہ کا رونا ان کے صفحات پر بھی ہے اور آج کے رسائل کے مقابلے میں ان کی تعداد اشاعت کم ہی تھی زیادہ نہ تھی لیکن اس کے باوجود ان میں استقامت آج کے رسائل کے مقابلے میں زیادہ تھی اور ان کی مختصر زندگی بھی ایسی گذری کہ ان کی یاد اور اہمیت اِمٹ ہوگئی ہے، ان کے لکھنے والوں میں جو حوصلہ اور ریاضت تھی، وہ آج کے لکھنے والوں میں کم ہی کو نصیب ہے۔ وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے کہ فن یکسوئی اور محنت کے بغیر کوئی رفعت حاصل نہیں کرسکتا۔ آج ہر چیز بہت جلد حاصل کرلینے کی ہوس اتنی شدید ہوگئی ہے کہ منزل تک جلد پہنچنے کی عجلت میں ہوش وحواس ہی بجا نہیں رہتے۔ طمانیت کی جگہ طمع نے لے لی ہے۔ آج کا نوجوان اگر کاروبار میں داخل ہوتا ہے، تو سال دو سال کے اندر ہی لکھ پتی بن جانا چاہتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا اور نہیں ہونے پر وہ ایسا فرسٹریٹڈ ہوتا ہے کہ سماج کے لیے ایک نفسیاتی مریض بن جاتا ہے۔ یہ مرض اسے ماضی سے متنفّر، حال سے غیر مطمئن اور مستقبل سے مایوس بنا کر ''ہپی'' مزاج بنا دیتا ہے۔ ادب میں بھی آج اسی عجلت کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ قلم ہاتھ میں لیا اور کرشن چندر، جمیل مظہری، بیدی، اختر الایمان، فیض، رشید احمد صدیقی، احتشام حسین، کلیم الدین احمد اور منٹو بن جانے کی عجلت میں مضحکہ خیز باتیں کر کے عجیب اور اہم بننے کی سعی کرنے لگے، چونکانے والی بات، کچھ حیران

کرنے والی بات، بالکل اس طور پر جیسے چورستوں پر دوا بیچنے والے کرتے ہیں۔

فنکار سے کوئی اس کے جدید بننے کے حق کو نہیں چھین سکتا۔ فنکار اپنے ماضی سے اس طور مطمئن نہیں ہوسکتا کہ وہ اس سے آگے جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس کرے۔ ایسا فن کار یقیناً اپنے اندر تخلیق کا جذبہ نہیں رکھتا، جو ماضی کو آخری حد سمجھ لے۔ اختراع، تخلیق، دریافت اور اقدار کی تخلیق سچے فن کار کے لیے ضروری ہے، لیکن ان سب کی دشمن ہے۔ دو برسوں، چار برسوں میں کرشن چندر، بیدی اور منٹو بن کر کوئی نہیں دکھا سکا ہے لیکن شاعری اور افسانوں میں محنت اور ریاضت سے جان چرانے اور مطالعے کے فقدان کے مظاہرے روزانہ دیکھنے میں آتے ہیں— ادبی نظریات کی تبلیغ اور وکالت تک بھی ایسی کوئی قابل گرفت اور بُری بات نہیں ہے، لیکن اس سلسلے بھی اسی کوئی قابلِ گرفت اور بُری بات نہیں ہے لیکن اس سلسلے میں جس تشدد پسندی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، وہ دوسرے شعبۂ حیات میں شاید منافع بخش ہو، مگر ادب میں یہ رویہ نہ پسندیدہ کہلایا ہے اور نہ منافع بخش ثابت ہوا ہے۔

ایسی ہی عجلت پسندی کا مظاہرہ ادبی رسائل کے اجرا کے سلسلے میں بھی کیا جاتا ہے، اور ایسے رسائل کے پہلے شمارے سے آخری شمارے تک یہی ایک بات سب سے نمایاں اور غالب رہتی ہے، بعض تو ایسے بھی رسالے شائع ہوئے جن کا پہلا شمارہ آخری ثابت ہوا— 'سوغات' نے زیادہ عمر نہیں پائی، مگر اردو ادب نہ سوغات کو بھول سکتا ہے، نہ محمود ایاز کو۔ 'شاہراہ' نے تو خیر لمبی عمر پائی مگر سچی بات یہ ہے کہ 'سوغات' کے مقابلے میں 'شاہراہ' کی لمبی عمر بھی اہمیت نہیں رکھتی، حالانکہ شاہراہ بھی اہم رسالہ تھا 'سوغات' میں طوفان خیزی نہیں تھی، ایک سنجیدہ انقلابی روتھی جو اسے جاوداں بنا گئی۔ جدیدیت کے پیش رو اور بالغ ادبی نظریات کی ترویج واشاعت کرنے والے رسالے کی حیثیت سے 'سوغات' اپنی ایک منفرد جگہ بنا گیا۔

(دسمبر ۱۹۷۰ء)

[3]

میں نے پچھلے شمارے میں ''مزامیر'' کے تحت بہت ہی اختصار کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار کیا تھا کہ اردو ہی نہیں انگریزی میں بھی فکشن پر جو تنقیدیں ہیں، وہ مقدار اور معیار دونوں کے اعتبار سے کم ہیں اور دراصل فکشن پر تنقید کا نہ تو کوئی طریقہ یا ضابطہ وجود میں آسکا ہے، اور نہ کوئی اصول مرتب ہوا ہے، ان

سطور کے بعد میرے پاس کئی خطوط آئے، کہ مجھے اس ''معاملے'' کو کچھ اور تفصیل سے کہنا چاہیے۔ دراصل تنقید جن لوگوں کا کام اردو میں رہا ہے اور جنھوں نے اپنے آپ کو نقاد مشہور کررکھا ہے، وہ بنیادی باتوں سے کتراتے ہیں اور ''نئی بات'' پر غور وخوض کے عادی نہیں ہیں۔ تنقید ہمارے یہاں بگڑے شاعر کی مرثیہ گوئی سے زیادہ اہمیت کی مالک نہیں ہوسکی ہے۔ انگریزی ادب سے کچھ بھیک مانگ کر تونگر بننے کی کوشش نے ہمارے نقادوں کو ادب کی دنیا میں ایک عجیب وغریب بنادیا ہے۔ شاعری کیا ہے اور نثر کیا ہے اوڈن کا جواب یہ ہے:

The Difference Between verse and prose is self evident but it is a sheer waste of the to look for a definition of the difference between poetry and prose.

اوڈن بھی اس نازک بحث سے کترا کر نکل جانا چاہتا ہے مگر اس کی بات میں وزن بھی ہے، وہ اس بحث میں پڑنے کو تضیع اوقات سمجھتا ہے، مگر اوڈن کی اس بات کے باوجود اس بحث کی کشش نقادوں کو اس بحث سے باز نہیں رکھ سکتی اور نہ رکھ سکی— رومانی دانشوروں کے نزدیک شاعری کوئی بیانیہ یا تشریحی اصطلاح نہیں ہے بلکہ یہ اشیا کو ایک خاص زاویہ سے دیکھنے اور مخصوص طور پر کہنے کا نام ہے Deffnce of Poetry میں شیلی نے نثر کو شاعری کے ذیل میں ہی شامل کردیا ہے اور یوں گویا فکشن کا مرتبہ اونچا کردیا ہے۔

پال والیری نے شاعری اور نثر کو رقص اور چہل قدمی (چلنا) کہہ کر دونوں کے درمیان خطِ امتیاز کھینچا ہے۔

Walking like prose, always has a definete object it is an art directed towards some objects that we aim to reach dancing is quite different is goes now here.

اردو میں کبھی کبھی یہ آواز بے سمجھے بوجھے اٹھائی جاتی ہے کہ افسانہ شعر بن گیا، یا بن رہا ہے۔ گویا یہ کوئی نئی بات کہی جارہی ہے اور پھر اس بات کا رتبہ ہی کیا ہے جسے بڑے انکشاف کے طور پر اردو کے ناقدین پیش فرماتے ہیں۔

ایلن ٹیٹ (Allen Tate) کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> We say to-day that there is poetry in prose fiction and where ever you have narrative fiction is poetry.

فکشن کا میڈیم کیا ہے:

کالرج کی تعریف پیش نظر ہو تو سیدھا سوال اٹھتا ہے کہ اگر لفظ شاعری کا میڈیم ہے تو پھر نثر کا میڈیم کیا ہے۔

اس کا جواب شاید یہی ہوسکتا ہے کہ نثر کا میڈیم خیال ہوگا۔ اب اگر میں یہ کہوں تو شاعروں کو یہ یقین نہ آئے اور غالباً اردو کے لکچرر نقاد بھی خفا ہوں کہ نثر لازمی طور پر ترقی پذیر شے ہے اور شاعری جامد شے ہے۔ میں نے پچھلے شمارے کے ''مزامیر'' میں لکھا تھا کہ ''علامت کا استعمال شاعری اور علامت کا استعمال فکشن میں دونوں شاید ایک نہیں!''

کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہم شاعری کی زبان پر جس قدر توجہ دیتے ہیں، اتنا فکشن کی زبان پر توجہ نہیں دیتے یا نہیں دے سکتے؟ — ہم ایک ناول کو یاد کرتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ وہ ایک نظام ہے الفاظ، علامت، آواز اور امیجز کا — بلکہ اسے عمل، سچویشن، سیٹنگ کے نظام کے طور پر یاد کرتے ہیں اور یوں پلاٹ اور کردار ہمارے لیے لازمی بن جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے عرض کیا تھا کہ علامت کی فکشن میں وہ اہمیت نہیں ہوسکتی جو شاعری میں ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے۔

نقاد کی بدنصیبی (جس سے وہ دامن جھٹک نہیں سکتا) یہ ہے کہ وہ تخلیق کو ان الفاظ سے مختلف الفاظ کے ذریعہ پرکھتا ہے جو تخلیق میں استعمال ہوتے ہیں۔ تخلیق کے الفاظ اور تنقید کے الفاظ کی ''دوری'' پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ دوری کیا کرتی ہے؟ کیسے تنقید کو متاثر کرتی ہے اور اسے تخلیق سے قربت کی بجائے دوری عطا کرتی ہے؟

شاعری میں ہیئت اور مواد کے عضویاتی رشتے کو الگ کیا ہی نہیں جاسکتا مگر فکشن میں وہ Differ کرتے ہیں۔ 'زندگی' فکشن کا میڈیم ہے — یہاں لکھنے والے کا کام یہ ہے کہ آر پار نظر آنے والے شیشے کو بالکل صاف رکھے۔ یوں کہ شیشے کا وجود بھی محسوس نہ ہو اور شیشے کے پار کی پوری زندگی قاری کے سامنے یوں ہو کہ شیشے کے ہونے کا احساس نہ رہے۔

افسانوی ادب کی تنقید کے لیے شاعری کے ذریعہ مرتب کردہ اصول وضوابط سے الگ ہی اصول وضوابط مرتب کرنے ہوں گے۔ یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم ارسطو سے اپنی جان چھڑالیں، یہ

محسوس کرلیں کہ نثر تہذیب کی دین ہے، اس کو پرکھنے کا معیار اور اصول بھی علیحدہ ہوگا۔

(ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۸ء)

[4]

ہم اردو رسائل کے مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں اور نہ اردو والوں کے لیے یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی خوش فہمی میں مبتلا ہوں کیوں کہ جس ملک میں خود زبان کا مستقبل محفوظ نہ لگے وہاں جریدوں اور رسائل کا کیا ذکر؟

آج فوٹو آفسٹ پر ایک دو رسالہ چند بڑے اشاعتی اداروں سے آفسیٹ پر چھاپی گئی ہیں، مختلف سرکاری اکیڈمیوں نے ادیبوں کی...... کتابیں چھاپنے کے لیے جزوی مالی تعاون، کتابوں پر بچوں کی طرح مٹھائی کھانے کے لیے رقوم بنامِ انعام — کیا یہ باتیں کسی زندہ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں؟

ویسے تو زندہ ہمارے وطن میں فارسی اور عربی بھی ہے، کیا اردو اسی سرد خانے میں لے جائی جارہی ہے؟ اندازہ لگانے والے مستقبل کے بارے میں اچھے خواب دیکھتے ہیں تو وہ ہر قدم پر سیاسی رکاوٹوں کے بار بار ٹوٹتے ہیں اور بکھر جاتے ہیں؟

ہم نالندہ جیسی تاریخ بننے والے ہیں کیا؟

ہم جو ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہیں تو کیا ہماری گویائی، ہمارے حروف، ہمارے الفاظ، ہماری تہذیب، ہمارا ورثہ — سب کا سب صرف اتنا کہہ دینے سے محفوظ ہوسکتا ہے؟

اتنا کچھ اس صفحے پر اس لیے رقم کیے دیتے ہیں کہ آئندہ آنے والی نسلیں ہماری فکر کا اندازہ کرسکیں اور ہماری بے عملی اور انفعالی کیفیت کا اندازہ کرسکیں۔

(۱۷ر ستمبر ۱۹۸۶)

ختم شد